

TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL  
LIBRARY

**OU\_222187**

UNIVERSAL  
LIBRARY



OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵۴۳۳۳ Accession No. ۱۳۳۵۲

Author مس-ک سدرشن ۱۳۳۵۳

Title گنج و مافیت

This book should be returned on or before the date last marked below.



حقوق بحق مصنف محفوظ

Checked 1978

رام کٹیبا بک پوسٹریڈ

# کج عاقبت

ایک نہایت ہی دلکش و سبق آموز مجلسی ناول

مصنفہ

فطرت نگار سردار شن صاحب

پبلشرز

رام کٹیبا بک پول لاہور

مارچ ۱۹۲۶ء



# کنج عافیت

(۱)

شام کا وقت تھا۔ میں جہاز کی چھت پر بیٹھا غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کسی شخص نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور شیریں آہ میں کہا۔ معاف کیجئے میں آپ کی تنہائی میں نخل ہوا ۛ

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا — یہ وہی تھا۔ میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ وہ میرے ساتھ مارسیلز ہی سے سوار ہوا تھا۔ اُس کی شکل و صورت اور عادات و اطوار پر تمام مسافر حیرت تھے۔ اُن میں سے ہر ایک کی خواہش تھی۔ کہ اُس کے ساتھ تعارف ہو جائے۔ مگر وہ سکے دن الگ پڑا رہتا تھا۔ میرے دل میں اُسے

دیکھتے ہی اُس کے لئے پُرسحر محنت پیدا ہو گئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح اُس سے واقفیت ہو جائے۔ تو سارے سارے دن اُس کے پاس ہی بیٹھا رہوں۔ قیام انگلستان نے مغربی تہذیب کا خوگر بنا دیا تھا۔ ورنہ ہندوستانی استقدر ظاہر داریوں کے کبھی پابند نہیں ہوئے۔ مگر وہ شخص سچا تنہائی پسند اور کم گو طبیعت کا آدمی تھا۔ جہاز کے دیگر مسافر ایک دوسرے کے دست بنگلے تھے اور دن رات اکتھے کھیلتے رہتے تھے۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنے ہی کمرے میں پڑا رہتا تھا۔ وہ انگریز تھا۔ مگر اُس کی پوشاک ہندوستانی طرز کی تھی وہ اس پوشاک میں دیوتا معلوم ہوتا تھا۔ ہندوستانی لباس میں لاکھوں آدمیوں کے جسم پر دیکھا ہے۔ مگر اُس انگریز کی سخی بصورتی میں نے کسی اور آدمی میں نہیں دیکھی۔ میں خود فیشن پرست آدمی ہوں۔ پر اُس انگریز کی سادگی پر میرا دل فریفتہ ہو گیا۔ اُسے دیکھ کر مجھے قومی غرور کا احساس ہونے لگتا تھا۔ اور میں خوشی سے جھومنے لگ جاتا تھا۔ اکثر اپنے ہمراہی مسافروں سے کہا کرتا۔ دیکھتے نہیں ہو۔ اُسے ہماری ہی چیز پسند ہے۔ مگر کیوں پسند ہے۔ یہ معمہ کسی کی بھی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں نے کئی دفعہ چاہا۔ کہ اُس سے بات چیت کروں۔ مگر تہذیب نے زبان پکڑ لی۔ اس وقت میں اس نام نہاد تہذیب پر جُجھلا اٹھتا تھا۔

اُسے سامنے دیکھا۔ تو میرا دل شگفتہ ہو گیا۔ بے تکلفی کے انداز سے

بولاً مطلقاً نہیں۔ میں خود اس تنہائی سے گھبرا گیا تھا۔ آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے؟“

اجنبی نے مسکرا کر کہا: آپ کس قدر مہربان ہیں؟  
”کیا میں آپ کو اپنے کمرے میں مدعو کر سکتا ہوں؟“  
”بڑی خوشی سے!“

میں اور وہ دونوں کمرے میں گئے۔ اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اس وقت مجھ پر ایک ایسے راز کا انکشاف ہوا۔ جس کی مجھے مطلقاً توقع نہ تھی۔ میں نے پوچھا: آپ کہاں جائیں گے؟  
”ملتان“

”کیا آپ وہاں نوکریں کس محکمہ میں؟“  
اجنبی نے جواب دیا: وہاں میرا گھر ہے؟  
”آپ کا گھر؟“

”ہاں میرا گھر۔ کیا آپ کو تعجب ہے؟“  
”درحقیقت میں سمجھتا تھا۔ آپ پہلی دفعہ ہندوستان جا رہے ہیں؟“  
”اور آپ کا خیال درست ہے۔ میں نے اس سے پہلے ہندوستان کے ساحل پر کبھی پاؤں نہیں رکھا۔“

میری حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ جس طرح بادل چھا جانے سے رات کی تاریکی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چہرہ مجھم سوال تھا۔  
انگریز نے ہنس کر کہا: آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ انگریز؟“

میں نے جواب دیا: اور کوئی وجہ نہیں۔ کہ میں آپ کو کچھ  
اور سمجھوں؟  
”مگر آپ غلطی پر ہیں“  
”تو“

”میں ہندوستانی ہوں؟“  
میں اپنی جگہ سے اُپھل پڑا۔ جیسے کوئی آن ہوئی بات سُن لی ہو  
حیرت سے بولا: میں نے جگہ جگہ کا پانی پیا ہے۔ مجھے اپنے آپ پر  
بہت بھروسہ تھا۔ کم از کم قومیت کے بارے میں میں کبھی دھوکا  
نہیں کھا سکتا۔ میں نے یورپ کے مختلف ممالک کے آدمیوں کی  
شناخت میں کبھی غلطی نہیں کی۔ مگر یہ خیال نہ تھا۔ کہ میں ایک  
ہندوستانی کو بھی نہ پہچان سکوں گا۔ شرم نے چہرہ لال کر دیا۔  
یہ ایک میں نے سر اٹھایا: مگر اپنے کہا تھا۔ کہ آپ ہندوستان  
پہلی دفعہ جا رہے ہیں؟

”واقعی؟“

”آپ ہندوستانی زبان جانتے ہیں؟“

”نہیں؟“

میری زبان بند ہو گئی۔ مگر میری آنکھوں سے حیرت مترشح  
تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے پوچھا: آپ ہندوستانی ہیں۔  
مگر آپ کا رنگ ایسا سُرخ و سفید ہے۔ آپ ہندوستانی ہیں مگر

آپنے ہندوستان نہیں دیکھا۔ آپ ہندوستانی ہیں مگر آپ ہندوستانی زبان نہیں جانتے۔ آخر یہ کیا مُعتمد ہے؟

اجنبی نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ اور کہا: اسوقت نہ پوچھو۔ کسی فرصت کے وقت میں تم سے اپنی داستان کہوں گا۔  
”نہیں۔ ابھی کہو۔ میرا دل بیتاب ہو رہا ہے۔ جب تک تمہاری کہانی نہ سُن لوں گا۔ مجھے چین نہ آئے گا۔“

اجنبی تذبذب میں پڑ گیا۔ شاید سوچ رہا تھا۔ کہ کسی ناواقف کو اتنی جلدی آپ بیتی سُنا دینا واجب ہے کہ نہیں۔ چہرے کا رنگ اس کی شہادت تھا۔ چند منٹ سکوت کا عالم طاری رہا اسوقت اُس کے دل میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اُس نے معذرت چاہی۔ کہا۔ کہ پھر کسی وقت کہوں گا۔ اسوقت رہنے دو۔ مگر میری مشرتی سرگرمیوں نے اُس کا منہ بند کر دیا۔ مجبور ہو کر بولا۔ تم پہلے شخص ہو۔ جس کے سامنے میں یہ واقعات رکھنے لگا ہوں۔ ورنہ میں اس سے پہلے کئی آدمیوں کو ٹال چکا ہوں۔ ظاہری کے دوکلے اُن کا جوش سرد کرتے رہے ہیں۔ پر تمہارے اصرار کے سامنے انکار کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ میں نے سنا ہے۔ تم ہندوستانی اخبارات میں اکثر مضامین لکھتے رہتے ہو۔ ممکن ہے میرے واقعات تمہیں دلچسپ معلوم ہوں؟

میں ہمہ تن گوش ہو کر سُننے لگا۔ اجنبی نے کہا۔

(۲)

اے بھائی! میرے آبا و اجداد ملتان کے رہنے والے تھے۔ وہاں اُنکے نام کی اب تک پُوجا ہوتی ہے۔ وہ صرف متمول ہوں یہ بات نہ تھی۔ اُن کے دل جنس شرافت سے بھی مالا مال تھے۔ میرے بابا کے نام کی سارے ملتان میں دھاک بندھی ہوئی تھی۔ وہ جب بازار میں نکلتے تھے۔ تو لوگ درشنوں کو ٹوٹ پڑتے تھے۔ اُنکے فیصلے برادری میں ناطق تھے۔ اُن کی ہر بات پتھر کی لکیر تھی۔ ہماری برادری میں کسی کو اُنکے سامنے سر اٹھانے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ کہتے ہیں۔ جس دن وہ مرے تھے۔ اُس دن ساہی شہر میں ہڑتال ہوئی تھی۔ اور اخبارات نے تائی نمبر شائع کئے تھے۔ اُن دنوں میرے والد صاحب انگلستان میں تھے۔ باپ کی وفات کی خبر سن کر اُن کا دل رنجیدہ ہو گیا۔ کئی دن تک روتے رہے۔ اور مکان سے باہر نہ نکلے۔ وہ وہاں پیرسٹری کے لئے گئے تھے۔ میری ماں نے لکھا۔ اب واپس لوٹ آؤ۔ مگر اُنہوں نے جواب دیا۔ اب واپس آنے کو جی نہیں چاہتا۔ میری والدہ دیہات کی رہنے والی تھی وہ پڑھنا لکھنا نہ جانتی تھی۔ اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا۔ کہ انگلستان کہاں ہے اور وہاں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ اپنے شوہر کا خط سن کر اُس کے ہوش اُٹ گئے۔ مگر وہ رونے دھونے نہیں بیٹھ گئی۔ اُس نے زمینداری کا بوجھ اپنے گماشتہ کے

کندھوں پر رکھ دیا اور آپ ولایت پہنچ گئی۔ محبت اُس کی راہنما بن گئی تھی۔ میرے باپ کو اُس کی وفاداری، محبت اور اخلاص پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ پر اُنہیں یہ خیال نہ تھا۔ کہ وہ اتنا فاصلہ تن تنہا طے کر سکتی ہے۔ مگر محبت کیا نہیں کر سکتی۔ اُس نے اُنہیں ہندوستان چلنے کے لئے بہت کہا۔ مگر میرے والد کو انگلتا کی سرزمین کچھ ایسی پسند آگئی تھی۔ کہ وہ واپس جانے کو رضامند نہ ہوئے۔ آخر اُنہوں نے لورپول میں ایک دکان کھول لی۔ اور کام کرنے لگے۔ چند ہی دنوں میں دکان چمک گئی۔ روپیہ پانی کی طرح آنے لگا ممکن ہے۔ اگر امرنی کی سبیل نہ بنتی۔ تو میرے والد ہندوستان کو واپس لوٹ جاتے۔ مگر دکان کا چل نکلتا اُن کے پاؤں کی زنجیر بن گیا۔ اُنہوں نے ہندوستان جانے کا ارادہ بالکل ترک کر دیا۔ اور زمینداری کا کام اپنے گماشتہ پر چھوڑ دیا۔ لے بھائی! اسی دنوں میں میں پیدا ہوا۔ میرے والدین کی خوشی کا ٹکنا نہ تھا۔ میرا نام ہری سین رکھا گیا۔ اور مجھے بٹے ناز و نعم سے پالا گیا۔ میں جب بڑا ہوا۔ تو مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں اپنے آپ کو انگریز ہی سمجھتا تھا۔ اُس وقت میری ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ میرے باپ اور ہندوستان کے درمیان یہ ایک ہی کڑی تھی۔ وہ بھی موٹ گئی۔ اب میرا باپ سولہو آنے انگریز تھا۔ وہ مجھے ہری سین نہیں بلکہ میر سین

کنکے بلایا کرتا تھا۔ میں اپنے آپ کو \* H. capur. کہا کرتا تھا۔ ہندوستانیت پر انگریزیت غالب آگئی تھی۔ کاش میری والدہ زندہ رہتی۔ تو مجھے یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ میں صرف غربت اور نیم ہی نہ تھا۔ بلکہ قومیت کے احساس سے بھی عاری تھا۔ مجھے یہ معلوم ہی نہ تھا۔ کہ میں ہندوستانی ہوں۔ اسی طرح عمر عزیز کے اٹھارہ سال گزر گئے۔ اور میں کالج میں داخل ہوا۔ اُس وقت مجھے پہلی دفعہ معلوم ہوا۔ کہ میں ہندوستانی ہوں۔ اے بھائی! مجھے معاف کرنا۔ مگر جھوٹ نہ بولو لگا۔ مجھے اس سے بچد صدہ ہوا۔

ہندوستان کے متعلق میرے خیالات چنداں اچھے نہ تھے۔ میں اپنی نگاہوں میں آپ ذلیل ہو گیا۔ اکثر سوچتا تھا۔ میں کیسا نصیب ہوں۔ کہ ہندوستانی والدین کی اولاد ہوں۔ سونے پستیل کا دھوکا ہو رہا تھا۔ میں اپنی قومیت کسی پر ظاہر نہ کرتا تھا۔ اُسے چھپا چھپا رکھتا تھا۔ جیسے سفید کپڑے پر بد نما داغ لگ گیا ہو۔ اب اُن ایام کو یاد کرتا ہوں۔ تو جسم کانپ جاتا ہے اور سر شرم سے ادبجا نہیں اٹھتا۔ لیکن اُس وقت یہ احساس نہ تھا۔ جب کبھی خیال آتا۔ کہ میں ہندوستانی ہوں۔ تو دل تڑپ جاتا تھا۔ جیسے کسی بدصوت شخص کے سامنے آئینہ آجائے۔ تو وہ نادم ہو جاتا ہے۔ میں

اپنا نام ہیریسین کا پر ہی بتاتا تھا۔ دستخط کرتا تو لکھتا H. capur. میرے دوستوں میں سے کسی کو معلوم نہ تھا کہ میں ہندوستانی ہوں

\* ہری سین کپور کی بجائے ایش کپور

نہ میں یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا میرے خیال میں ہندوستانی اور  
جراثیم پیشہ ہم معنی الفاظ تھے۔ جب کبھی کوئی ہندوستانی جنٹلمین  
ہماری دکان پر آجاتا۔ تو میں اُس کی طرف نہایت غوسے دیکھا  
کرتا تھا۔ اور سوچتا تھا۔ کہ اس میں اور مجھ میں کون کونسی چیز  
مشترک ہے۔ رنگ۔ ڈھنگ۔ آنکھیں۔ چال۔ گفتار۔ رفتار  
سب الگ الگ تھے۔ میں اطمینان کا سانس لیتا تھا۔ جیسے کوئی  
مقدمہ جیت کر خوش ہوتا ہے۔ مگر جب یہ خیال آتا۔ کہ کسی دن  
ممکن ہے۔ میری قومیت عوام پر ظاہر ہو جائے۔ تو میرے دل  
بوجھ سا پڑ جاتا تھا۔ اور میں تقدیر کو گالیاں دے ڈالتا تھا۔ آخر  
ایک دن وہی ہوا۔ جس کا خطرہ تھا۔ میری قومیت کالج کے دوسرے  
طلباء پر ظاہر ہو گئی۔ شام کا وقت تھا۔ میں اپنے ایک دوست  
کے ہاں چائے پینے گیا۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی کہا: "ہیلو!  
آج ایک نئی بات معلوم ہوئی:"

مجھے کچھ کچھ مشبہ ہوا۔ گھبرا کر بولا: "کیا؟"

"مگر مجھے یقین نہیں آتا"

"تم پہلے وہ بات تو بتاؤ"

"غصہ تو نہیں کرو گے؟"

"نہیں"

مگر دل میں آگ لگی ہوئی تھی۔

اُس نے رُک رُک کر کہا: تم مٹرا ہی کر اس کو جلتے ہو؟  
 ” بڑی اچھی طرح سے“

” وہ آج کلب میں کہہ یا تھا۔ کہ تم ہندوستانی ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟“  
 میری آنکھوں سے آگ کے شرارے نکلنے لگے۔ ایسا معلوم  
 ہوتا تھا۔ جیسے کسی نے میرے سامنے میری توہین کر دی ہے۔ اگر  
 اُس وقت میرے ہاتھ میں پستول ہوتا۔ اور کر اس سامنے آجاتا۔  
 تو میں اُسے وہیں ڈھیر کر دیتا۔ میں نے کس قدر کوششیں کی  
 تھیں کیسی احتیاطیں کی تھیں اُن سب پر پانی پھر گیا۔  
 میری قومیت اب ایک کھلا ہوا راز تھا۔

تاہم میں نے حوصلہ مندی کے انداز سے جواب دیا: وہ راسکل جھوٹ  
 بولتا ہے۔ اس کا خمیازہ اُسے بھگتنا پڑیگا۔

کننے کو تو یہ کہہ دیا۔ مگر طبیعت مطمئن نہ ہوئی۔ دوسرے دن کالج  
 جلتے ہوئے شرم محسوس ہوئی۔ جیسے مجھ سے کوئی گناہ سر دھو چکا  
 ہو۔ میں نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ اور دکان کا کام کرنے لگا۔ دو  
 سال میرے والد کا بھی انتقال ہو گیا۔

(۳)

اے بھائی! میں نے دل کھول کر عیش کئے۔ روپیہ۔ محسن اور  
 جوانی۔ زندگی کی تین نعمتیں ہیں۔ مجھے یہ تینوں میسر تھیں میں اپنی  
 تعریف نہیں کرتا۔ مگر یہ امر واقعہ ہے۔ کہ میں عام انگریزوں کی

نسبت زیادہ خوبصورت ہوں۔ کم از کم لوگوں کا یہی خیال ہے۔ مجھ میں رنگ کی خصوصیت نہیں۔ ہر انگریز کارنگ سفید ہے۔ مگر مجھ ایسے ہندوستانی نقش و نگار انگریزوں میں کہاں ہیں؟ انہوں نے کئی عورتوں کو تباہ کر دیا۔ میں اُن کے جذبات سے کھیلتا تھا اُن سے ہنسنا تھا۔ مگر دائرہ تہذیب سے کبھی باہر نہیں ہوا یہاں تک کہ ایک لڑکی سٹیلانے اپنی پوری قوت سے مجھ پر حملہ کیا۔ یہ لڑکی انتہا درجہ کی خوبصورت تھی۔ اُس کی شکل شہزادوں کی سی تھی۔ وہ عام انگریز لڑکیوں کے مانند اچھی نہ تھی۔ نہ بات بات میں دانت کھول کر تمقہ لگاتی تھی۔ وہ صرف مسکراتی تھی۔ میرا قصردل فتح ہو گیا +

سٹیلامیری دکان پر اکثر آنے جانے لگی۔ میں سب سے پہلے اُس کی طرف توجہ کرتا تھا۔ اور کوشش کرتا تھا۔ کہ اُسے زیادہ دیر تک رُکنا پڑے۔ میں اُس کی طرف اس طرح دیکھتا تھا جس طرح بچہ تصویر کی طرف دیکھتا ہے یہ محبت کے ابتدائی مدارج تھے۔ جو بہت جلد طے ہو گئے۔ اور ہم ایک دوسرے کے ساتھ آزادی سے ملنے لگے۔ اب اگر وہ ایک دن بھی نہ آتی۔ تو میں بیتاب ہو جاتا تھا۔ جیسے شرابی شراب نہ ملنے سے بیتاب ہو جاتا ہے۔ میں اُس کے انظار میں کئی کئی گھنٹے دروانے پر کھڑا رہتا تھا۔ اس عقیدت سے کسی عابد مراض نے اپنے معبود کی بھی پرستش نہ کی

ہوگی اور یہ صرف میری ہی حالت نہ تھی۔ اُس کا بھی یہی حال تھا مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے پر رونق آجاتی تھی۔ آنکھوں میں چمک۔ اکثر کہا کرتی تھی۔ کہ تمہارے بغیر مجھے چین نہیں آتا۔ گھر جاتی ہوں تو کھوئی کھوئی رہتی ہوں۔ تم یہاں دکان پر بیٹھے کام کرتے ہو۔ مگر میں گھر میں بیٹھی ٹھنڈے سانس بھرتی ہوں۔ میری حالت کا تصور کرنا ہو۔ تو مچھلی کو گرم ریت پر رکھ کر دیکھ لو۔ بالکل اسی طرح تڑپتی ہوں۔“

میں یہ سنتا۔ تو سو رنگ میں پہنچ جاتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام دُنیا کی برکتیں میرے ہی لئے بنی ہیں۔ اور مجھ سا خوش نصیب آدمی دُنیا بھر میں نہ ہوگا۔ اے بھائی! وہ جادو ٹوٹ چکا ہے۔ مگر اب بھی میرا یہی خیال ہے۔ کہ سٹیلا سی حسینہ میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ پتھیوں کے قصے میں نے کتابوں میں پڑھے تھے۔ اُن کا راہزنِ صبر و شکیبِ حُسنِ تصویروں میں دیکھا تھا۔ اُنکی دلفریبِ ادائیں ناکوں میں مشاہدہ کی تھیں۔ مگر یہ خیال نہ تھا۔ کہ اُن کا حقیقی وجود بھی ہے۔ سٹیلا نے اس خیال کو رو کر دیا۔ اُس پر شہر کے پیسوں امیر زادے فریفتہ تھے۔ مگر وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہ کرتی تھی۔ میں اس خیال سے دیوانہ وار جھومنے لگ جاتا تھا۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ سٹیلا کرسمس کے لئے کپڑے اور زیورہ نوازی

تھی۔ وہ اپنی ہر ایک چیز مجھے دکھاتی تھی اور خوش ہوتی تھی۔ اس کے بغیر وہ رہ نہ سکتی تھی۔ کم از کم میرا یہی خیال ہے۔ میں نے سوچا۔ مجھے بھی کچھ تحفہ دینا چاہئے۔ مگر کیا تحفہ ہو؟ میں تذبذب میں پڑ گیا۔ کئی دن تک سوچتا رہا۔ آخر میں نے اک موتیوں کا ہار پسند کیا۔ یہ ہار اتنا خوبصورت اور خوش رنگ تھا۔ کہ میں زمین سے اُچھل پڑا۔ مگر قیمت سنی تو دل بیٹھ گیا۔ ایک سو پانس پونڈ۔ میں نے اُسے ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور دوسرے ہار دیکھنے لگا۔ مگر اُن میں سے کوئی بھی نگاہوں میں نہ چھا۔ آخر کفایت شعاری پر محبت غالب آگئی۔ میں نے ہار خرید لیا۔ اور سٹیلا کی نذر کر دیا۔ اُسے دیکھ کر سٹیلا ادائے غور سے جھومنے لگی۔ اور پھر میری طرف دیکھ کر بولی بے کیا میں تمہارا شکر یہ ادا کروں؟

”نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں؟“

”اچھا۔ اس کی قیمت کیا ہے؟“

”تمہاری نگاہ محبت؟“

”نہیں۔ بیچ بیچ کو؟“

”اسے کرسمس کے دن پہننا؟“

سٹیلا جوش محبت سے بیقرار ہو کر مجھ سے چمٹ گئی۔ اس وقت اُس کا پیلا کیسا ستھا، کتنا حقیقی معلوم ہوتا تھا۔ مجھ پر جاؤ وسا ہو گیا۔ میں نے اس وقت تک اپنے آپ کو ضبط کیا تھا۔ مگر اس وقت دل بے قابو ہو گیا

میں نے سٹیلا کے دونوں زینین ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ اور  
 محبت کے دفتر کھول دیئے۔ یہ میری قسمت کا امتحان تھا۔ مجھے کبھی تقریر  
 کرنے کا موقع نہیں ملا۔ نہ میں سمجھتا ہوں۔ کہ میں تقریر کر سکتا ہوں۔  
 مگر اس وقت میرے لفظ لفظ پر فصاحت قربان ہو رہی تھی۔ فصاحت  
 سٹیلا کے دل میں بیٹھ گئی۔ میں نے اُسکے سامنے بیاہ کی تجویز رکھی۔  
 اُس نے زبان سے جواب نہ دیا۔ صرف مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اور گڑن  
 جھکالی۔ میری خوشی کا لگانا نہ رہا۔ میں امتحان میں پاس ہو گیا تھا۔  
 کرسمس کا دن تھا۔ شام کا وقت۔ لوگ تنھوں سے لے ہوئے  
 اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ اس وقت اُن کے چہروں پر کیسی  
 مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں کیسی خوشی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا  
 آج دنیا سے سچ و غم کا نام و نشان تک مٹ گیا ہے۔ مگر میرا دل دس  
 تھا۔ سٹیلا ابھی تک نہ آئی تھی۔ میں مجسم انتظار تھا۔ میری نگاہیں  
 دروازے میں لوٹ رہی تھیں۔ مگر اُس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں با-  
 بار جھنڈنا اٹھتا تھا۔ سوچتا تھا۔ اُسے میرا ذرا بھی خیال نہیں رہے  
 ایسا انتظار نہ دکھاتی۔ ارادہ کیا۔ اب اُس سے بات نہ کروں گا۔ معاً  
 کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ منتظر دل دھڑکنے لگا۔ نگاہیں  
 دوڑ کر دروازے میں کھڑی ہو گئیں۔ دیکھا یہ وہی تھی۔ مگر کتنی  
 اُواس اور افسردہ دل۔ چہرہ یاس و حسرت کی زندہ تصویر تھا۔  
 میرا غصہ پانی پانی ہو گیا۔ محبت اس افسردہ دلی کو دیکھ نہ سکتی



لوہے کے ہلکے ہلکے کیل دریا میں ڈوب جاتے ہیں۔ اُسکی آنکھوں کے سیلاب رداں میں کوئی فرق نہ پڑا۔ یہ دیکھ کر میرا دل بیتاب ہو گیا۔ میں نے اُس کے قریب جا کر اُسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ عورت زیور کے نقصان کو شدت سے محسوس کرتی ہے۔ میں جلدی جلدی بازار گیا۔ اور اُسی قسم کا ایک اور ہار خرید لایا۔ سٹیلا کے زخموں پر مرہم لگ گیا۔ اُس کے بہتے ہوئے آنسو رُک گئے۔ میرے دل کو اطمینان ہوا۔ جیسے ڈبٹی ہوئی کشتی کو کنارہ مل جاتا ہے۔

اس کے بعد رستہ کھل گیا۔ سٹیلا مجھ سے پلے درپلے فرمائشیں کرنے لگی۔ اول اول مجھے اس سے خوشی ہوتی۔ میں سمجھتا تھا۔ کہ یہ فرمائشیں کر کے سٹیلا مجھ پر احسان کر رہی ہے۔ لیکن بعد میں اُس کے یہ احسان بار ہو گئے۔ ہم دن کو سمندر کی سیر کرتے۔ رات کو تھیٹر دیکھنے جاتے۔ دکان کی طرف دھیان نہ رہا۔ ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ بکری کم ہو گئی۔ مگر میں نے پھر بھی پروا نہ کی۔ اور اپنے مغربی مشاغل میں غرق رہا۔ یہاں تک کہ دکان کا دیوالہ نکل گیا اور میں تباہ ہو گیا۔ اب مجھے سٹیلا کی نگاہیں کچھ کچھ بدلی ہوئی معلوم ہوئیں۔ مگر میں نے خیال کیا۔ کہ یہ میرا نفسِ شب ہے۔ میں نے رین کی دیوار کھڑی کی۔

رات کا وقت تھا۔ میں اور سٹیلا ناکٹ دیکھ رہے تھے۔ بکا پاک

تماشا شیوں میں پلچل مچ گئی۔ آرڈر آرڈر کی آوازیں سنائی دیں۔  
 مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ تماشہ میں کچھ ہندوستانی طلباء آگئے تھے۔ اُن میں  
 اور انگریزوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ اتنے میں کسی نے کہا  
 ہندوستانی سوڑوں کو مارو۔ میں نہیں جانتا۔ اُسوقت مجھے کیا ہوا  
 میں اُسوقت اپنے آپ میں نہ تھا۔ مجھ پر اک جنون سا سوار تھا۔  
 میں جوش کی حالت میں آگے بڑھا۔ اور اُس جگہ جا پہنچا۔ جہاں  
 انگریز ہجوم ہندوستانی طلباء کو زد و کوب کر رہا تھا۔ میں نہیں کہہ  
 سکتا میرے ہاتھوں میں کہاں سے طاقت آگئی تھی۔ میں ہجوم کو  
 چیرتا ہوا نکل گیا۔ اور ہندوستانیوں کی طرف سے لڑنے لگا۔  
 ہندوستانی طلباء پیسا ہو رہے تھے۔ مجھے اپنی طرف سے لڑتے  
 دیکھ کر اُن کے اُکھڑتے ہوئے پاؤں جم گئے۔ اور وہ ڈٹ کر مقابلہ  
 کرنے لگے۔ میں اُن کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ کہ اتنے میں میرے  
 سر پر ایک ہنٹ پڑا اور میں بہوش ہو کر گر پڑا۔

جب مجھے ہوش آیا۔ تو میں نے اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا  
 مگر زخم معمولی تھا۔ دو چار دن میں ٹھیک ہو گیا۔ اب مقدمہ پیش ہوا  
 میرے بیان سے عدالت میں سنسنی پھیل گئی۔ کسے خیال ہو سکتا تھا۔  
 کہ میرے جیسا آدمی ہندوستانی ہو سکے گا۔ لوگ کانپ اُٹھ سکیں کہنے  
 لگے۔ ہندوستانی طلباء میری طرف اس طرح دیکھتے تھے۔ گویا میں اُنکا  
 معبود ہوں۔ مگر مجھے اس پر حیرت نہ تھی۔ حیرت اس بات پر تھی

کہ سٹیڈا نے میرے حق میں شہادت دینا منظور نہ کیا۔ کیا تعجب کا مقام نہ تھا۔ کہ جس عورت کی خاطر میں نے اپنا کاروبار تباہ کر دیا۔ اپنی مستقل آمدن برباد کر دی۔ جس کی خاطر میں نے اپنی زندگی اِدُو اُس کے مستقبل کا خیال نہ کیا۔ وہ عورت میری خاطر دو کلمات چہ کہنے کو بھی تیار نہ ہوئی۔ ریت کی دیوار گر گئی۔ اُسوقت وہ عدالت میں تھی اُس نے میری طرف دیکھا۔ مگر اِس طرح جیسے وہ آسمانی مخلوق ہو۔ اور میں زمین پر رہنے والا حقیر کپڑا میں سنائے میں آ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں اسوقت غور پڑھا تھا۔ وہاں کبھی محبت کھیلتی تھی +

مقدمے کا فیصلہ ہوا۔ تو لوگ حیران رہ گئے۔ مجھے دس دن کی سزائے قید کا حکم ہوا۔ اخبارات میں شور مچ گیا۔ مگر مجھے پر واپہ تھی۔ رہا ہوا۔ تو ہندوستانی طلباء نے میرا جلوس نکالا۔ اور کہا اِڈریس دیا۔ ساتھ ہی ایک Purse بھی پیش کی۔ اِس اِڈریس سے میرا داغ آسمان پر پہنچ گیا۔ سوچنا تھا۔ میں کیسا خوش نصیب ہوں۔ جو ہندوستانی ہوں۔ انگریز کئی سال بنا رہا۔ کسی نے پڑا نہ کی۔ ہندوستانی ایک دن بنا۔ اِڈریس ملنے لگے۔ مگر مجھے سب سے زیادہ رنج سٹیڈا کی بدسلوکی پر تھا۔ کیسی بیوقوف عورت ہے۔ میں نے اُس پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ مجھے یہ خواب میں بھی خیال نہ تھا۔ کہ وہ وقت پر آنکھیں چڑا لے گی۔ اُس دن میرے دل میں اپنی

قومیت پر غرور کا احساس ہوا۔ شام کو جب اخبار ڈیلی ہیرلڈ کا نامہ نکار مجھ سے انٹرویو کرنے آیا۔ تو میں نے بڑے فخر سے کہا۔  
 ”ہاں! میں ہندوستانی ہوں۔ اور پر ماتا کا شکر ہے۔ کہ میں  
 کچھ اور نہیں ہوں۔ نامہ نگار نے پوچھا: آپ کا انگریزی  
 عدالتوں کے متعلق کیا خیال ہے؟“

میں نے جواب دیا: اگر میں اپنی قومیت کا اظہار نہ کرتا۔ تو  
 میرا خیال ہے فیصلہ بالکل برعکس ہوتا۔ مگر جو خوشی مجھے اس  
 سزا سے ہوئی ہے۔ وہ رٹائی سے کبھی نہ ہوتی۔ قصور سراسر  
 ہجوم کا تھا ہندوستانی طلبا بالکل راستی پر تھے؟  
 ”آپ نے اس فساد میں کیوں حصہ لیا؟“  
 ”یہ بالکل قدرتی تھا۔ میں رو نہیں سکتا تھا؟“

”پر کیوں؟“

”میرا خون جوش مارنے لگا تھا؟“

”تو آپ نے ہجوم پر حملہ کیا؟“

”جی نہیں۔ ہجوم نے مجھ پر حملہ کیا۔ اور میں ہی زخمی ہوا۔ ہر ایک  
 شخص جو ہجوم میں شامل تھا۔ میرے ساتھ اس رائے میں متفق  
 ہو گا کہ مجھے سزا دینا محض اپنی قومیت کی طرفداری کرنا تھا؟  
 اس انٹرویو کا اخبارات میں مہینوں چرچا رہا +

(۵)

اے بھائی! میری دکان کا دیوالہ نکل گیا تھا۔ مگر مجھے پھوکوں  
 نہیں مرنا پڑا۔ میرے احباب کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ میں اُنکے  
 سامنے روپے پیسے کا کبھی مُنہ نہ دیکھا تھا۔ میرے اس مصیب کے  
 وقت وہ دریا دلیاں کام آ رہی تھیں۔ جس دُست سے جو چاہتا  
 تھا۔ مانگ لیتا تھا۔ کوئی انکار نہ کرتا تھا۔ اسی طرح کچھ مہینے گز-  
 گئے۔ تب یار دوستوں کی سرگرمیاں سر دھریوں میں تبدیل ہونے  
 لگیں۔ اب وہ مجھے آتا دیکھتے۔ تو مُنہ دوسری طرف پھیر لیتے تھے  
 میں بلاتا تھا۔ تو انہیں آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یہاں تک کہ مجھے  
 تین دن فاقے سے نکل گئے۔ جی چاہتا تھا۔ کسی سے کچھ مانگ لوں  
 مگر غیرت ہاتھوں کو آگے نہ بڑھنے دیتی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا  
 اب کسی سے کچھ نہ مانگوں گا۔ امارت لٹ چکی تھی۔ اُس کی شان  
 باقی تھی۔ میں نے ہندوستان بحری تار بھیجا تھا۔ اور اپنی اراضی کے  
 گماشتہ سے روپیہ مانگا تھا۔ اس وقت اُسی کے انتظار میں تھا۔  
 دوپہر کا وقت تھا۔ میں اپنے کمرے کے باہر کھڑا سوچ رہا تھا  
 کہ آج کا دن کیسے کٹے گا۔ اتنے میں چٹھی رساں آتا دکھائی دیا  
 کلیجہ دھڑکنے لگا۔ خیال آیا۔ کیا ممکن ہے۔ کہ میرا کوئی منی آرڈر  
 ہی آیا ہو۔ کوئی پیسہ ہو۔ کوئی رجسٹری۔ کوئی خط۔ اس خیال سے  
 طبیعت شگفتہ ہو گئی۔ جیسے بہار کے جھونکوں سے پھولوں میں

تازگی آجاتی ہے۔ مگر دوسرے خیال سے ل پر پھر مایوسی چھا گئی۔ جیسے پھول گرم ٹوسے مر جھا جاتے ہیں۔ مگر نہیں۔ اُمید سامنے کھڑی تھی۔ چٹھی رساں میرے پاس آ کر رکا۔ اور ایک خط میرے ہاتھ میں دے کر آگے نکل گیا۔ میں نے خط کھول کر پڑھا۔ تو خوشی سے اُپھل پڑا۔ یہ میرے ملتان کے گماشتہ کا خط تھا۔ جس نے مجھے اطلاع دی تھی کہ ایک ہفتہ ہوا۔ آپ کے حساب میں آٹھ سو پونڈ ایسٹرن بینک کو بھیج دئے گئے ہیں اس خبر سے ایسا خوش ہوا گویا ڈربنی کی لائٹری جیت لی ہے۔ چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا۔ پاس سے ایک آئینی بس گزر رہی تھی۔ میں اچک کر اُس پر سوا ہو گیا۔ اور بولا۔ ایسٹرن بینک کو لے چلو؟

دعاں جا کر میں نے کچھ روپیہ نکلوایا۔ اور ایک ہوٹل میں پہنچا۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ اُسوقت میں کھانے پر اس طرح ٹوٹا۔ جس طرح بھوکے بھیڑیے بر فانی علاقوں میں گھڑوں پر ٹوٹتے ہیں۔ باہر نکلا۔ تو آنکھوں میں پھر وہی غور نٹھا چہرے پر پھر وہی بے فکری۔ اتنے میں دیکھا۔ سامنے سے سٹیلا آرہی ہے۔ اُس کی حالت میں زمین آسمان کا فرق پڑ گیا تھا۔ نہ آنکھوں میں وہ چمک تھی۔ نہ ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ۔ رنگ موسم خزاں کے درختوں کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا۔ کہ یہ عورت کبھی لور پھل بھر میں خوبصورت ترین عورت ہو گی۔ میری آنکھوں میں

آنسو بھرتے ہیں نے مغربی تکلفات کو بالائے طاق رکھا۔ اور آگے بڑھ کر کہا: کیوں؟ ہمیں کیا ہوا ہے؟

سٹیلا نے اپنی آنکھیں میری طرف اٹھائیں۔ مگر اُن میں وہ موہنی، وہ رونق، وہ دلکشی نہ تھی۔ تب ہم دونوں کی نگاہیں ملیں۔ پر اُس پُرانی محبت، آزادی، بے تکلفی سے نہیں۔ ایک میں غرور بھرا ہوا تھا۔ دوسری میں افلاس و ملامت کے جذبات چھپے ہوئے تھے۔ سٹیلا کی زبان سے بات نہ نکلتی تھی۔ اُس نے صرف اتنا کہا خدا کے لئے میری مدد کرو۔ اور رونے لگی۔

میں نے زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ افلاس سے زیادہ رنج و اظہار کا اظہار ہے۔ انسان افلاس سے نہیں ڈرتا۔ مگر اُس کے اظہار سے اُس کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ میں نے چک چک نکالی اور اٹھ پونڈ کا چک کاٹ کر سٹیلا کے ہاتھ میں دیدیا۔

شائد سٹیلا کو مجھ سے یہ اُمید نہ تھی۔ اُس نے میری طرف اِس طرح دیکھا۔ جس طرح سہا ہوا پر تقصیر بچھاپنے محسن کی طرف دیکھتا ہے۔ اور آہستہ آہستہ چلی گئی۔ شدت جذبات نے اظہارِ مشکرتہ کی اجازت نہ دی۔ میں اپنے مکان پر پہنچا اور کوچ پر لیٹ کر سگار پینے لگا۔ کوئی ایک گھنٹہ گزرا ہوگا۔ کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور بنک کا ایک آدمی سٹیلا کو ساتھ لئے ہوئے اندر آیا۔ اُس نے آتے ہی سٹیلا کا چک میرے ہاتھ میں دیدیا۔ اور پوچھا: یہ چک درست ہے؟

میرا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ چک میں آٹھ کے استی ہوٹل بنائے ہوئے تھے۔ اے بھائی! اگر میں چاہتا۔ تو اسی وقت سیٹلا کو گرفتار کر سکتا تھا۔ اُس کا جرم روز روشن کی طرح عیاں تھا وہ سزا سے بچ نہ سکتی تھی۔ اُس کی بے وفائی میری آنکھوں کے سامنے پھر گئی میرے دل میں مسرت خیز گدگدی ہونے لگی +

مگر پھر خیال آیا۔ آخر یہ عورت ہے۔ عورت کا دل کمزور ہوتا ہے۔ ارانے پست۔ پتہ نہیں۔ کن وجہ سے اُس نے میرے ساتھ پوفانی کی۔ وہ اس وقت انتہا درجہ کی تکلیف میں معلوم ہوتی ہے۔ اُس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ورنہ ایسا جرم کرنے کی کبھی جرأت نہ کرتی۔ مرے کو مارنا کہاں کی مردانگی ہے۔ میں نے اُس کی طرف استفسار بھری نگاہوں سے دیکھا۔ وہ بھرے ہوئے پستول کے سامنے کھڑے ہوئے گھوڑے کے مانند کانپ رہی تھی۔ اُس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ مگر نگاہوں نے جذبات کے دفتر کھول دیئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہہ رہی ہے۔ میں نے تم سے دعا کیا سی۔ مگر کبھی تمہاری تھی۔ کیا تم میری لاج نہ رکھو گے +

اس نگاہ نے میرے ارادوں کو زیر و زبر کر دیا۔ انتقام کا خیال اوجھا معلوم ہونے لگا۔ میں نے چک سے نگاہ اٹھا کر

۱۵ آٹھ کے ہند سے کے آگے صفحہ الدینا نہایت آسان ہے۔ اسی طرح

Eight کا Eighty بنا لینا چنداں مشکل نہیں +

بنک کے آدمی کی طرف دیکھا۔ اور کہا: ہاں یہ درست ہے۔“  
”مگر“

”تمہاری احتیاط بجا ہے۔ میں نے پہلے آٹھ پونڈ لکھے تھے بعد میں انسٹی بنا دئے۔ لاؤ دستخط کروں۔ مجھے افسوس ہے۔ اس غریب لیڈی کو اسقدر زحمت اٹھانا پڑی۔“  
اور یہ کہتے کہتے میں نے جہاں جہاں بعد میں حروف کا اضافہ کیا گیا تھا۔ وہاں اپنے دستخط کر دئے۔

(۶)

دوسرے دن مجھے ایک ہندوستانی جنٹلمین ملنے آئے۔ نیکے ساتھ ان کی بیوی بھی تھی۔ خاوند کا نام روپ چند تھا۔ بیوی کا دیوکی۔ دونو مندب اور ملنسار تھے۔ ان سے مل کر جی خوش ہو گیا۔ دیوکی نہایت حسین تھی۔ اس نے ہندوستانی وضع کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اس لباس نے اس کی خوبصورتی کو پر لگا دئے تھے۔ اس کے جسم پر نہ زیور تھے۔ نہ چہرے پر پوڈر۔ مگر اس کو دیکھ کر آدمی مرعوب ہو جاتا تھا۔ وہ زمین کی مخلوق معلوم نہ ہوتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سادگی تھی۔ چہرے پر بھولاپن باتیں کرتی تھی۔ تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ وہ سر نہ ہلاتی تھی۔ نہ آنکھیں مٹکاتی تھی۔ اس کے باوجود اس کی ایک ایک ادائیگی جادو تھا۔ مگر یہ شوخی و شرارت کا جادو نہ تھا۔ نہ اس میں عریانی و

تصنع کو دخل تھا۔ یہ وہ جادو تھا۔ جو شاید جادوئے حسن سے بھی زیادہ پُر زور، زیادہ پُراثر ہوتا ہے۔ عیصمت و پاکیزگی کا جادو تھا مجھے اُس دن پہلی دفعہ علم ہوا کہ ہندوستانی حُسن کے مقابلہ میں مغربی حُسن کس قدر کم بضاعت و بے حقیقت ہے مگر اُس حُسن سے کہیں زیادہ وہ جہاتھی۔ جو مجھے دیو کی کے چہرے پر دکھائی دی۔ میری نگاہیں اُس کے پیروں میں لوٹنے لگیں۔ اُنہیں چہرے پر اٹھنے کا حوصلہ نہ تھا۔ وہ چند گھنٹے میرے پاس ٹھہرے۔ مختلف مضامین پر گفتگو ہوتی رہی۔ تب مجھے معلوم ہوا۔ کہ دیو کی اور روپ چند و نو بیحد ذہین و ذکی ہیں۔ میں جس مضمون پر بات چھیڑی انہوں نے میرا منہ بند کر دیا۔ میں ہر ہر دفعہ سٹپٹا کر رہ گیا۔ اُس وقت خیال آیا۔ کیا یہی عورتیں ہیں۔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ اُن کو کسی بھی بات کا سبقہ نہیں۔ اگر اُن کو تعلیم نہیں دے جاتی۔ اگر اُن کی تربیت کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ تو کیا یہ اُن کا قصور ہے؟

وہ جانے کے لئے تیار ہوئے۔ میں اُداس سا ہو گیا۔ مجھ پر کسی نے جادو نہیں کیا۔ سحر نہیں کیا۔ مگر میرا دل بس میں نہ تھا۔ میں نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے رُک رُک کر کہا۔ میرا خیال ہے۔ آپ اب اکثر یہاں آتے رہیں گے؟

اس کے جواب میں روپ چند صرف مسکرائے۔ اُنہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر دیو کی نے آہستہ سے کہا۔ تمہیں ہندوستانی

بنانے کے لئے“

کیسی زبردست چوٹ تھی۔ کیسا لطیف مذاق۔ میرے دل میں جذبات کے طوفان برپا ہو گئے۔ سوچنے لگا۔ کیسی حماقت کی۔ جو آج تک ہندوستانیوں سے متفرق رہا۔ اگر مجھے پہلے علم ہوتا۔ کہ وہ ایسے ہنس مکھ، ایسے مہذب ایسے فلسفار ہیں۔ تو اپنی قومیت پر کیوں نام ہوتا۔ اس چند گھنٹوں کی ملاقات سے میرے خیالات میں انقلاب آ گیا۔ میں نے ارادہ کیا۔ کہ اب سٹیلا کا خیال ترک کر دوں گا۔ اور روپ چند اور دیو کی کے ساتھ ہندوستان لوٹ جاؤں گا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ ہمارے باہمی تعلقات بڑھنے لگے۔ اب دیو کی اور روپ چند ہر روز شام کے وقت آتے اور ڈیڑھ دو گھنٹہ میرے پاس ٹھہرتے تھے۔ ان کی باتوں میں وقت گزرتا معلوم نہ ہوتا تھا۔ جی چاہتا تھا۔ گھڑی کی سوئیاں ساکن ہو جائیں۔ مگر وقت کو کس نے پکڑا ہے؟ جب وہ مجھ سے ہندوستانی گھروں کی اندرونی زندگی کا بیان کرتے تھے۔ تو میری آنکھوں سے آنسوؤں کی بھڑی لگ جاتی تھی۔ میں کہتا تھا۔ کیا کہانیاں سنا رہے ہو۔ دیو کی مسکرا کر جواب دیتی۔ تم مغرب میں پیدا ہوئے ہو۔ مغرب کی آب و ہوا میں پلے ہو۔ یہاں ماڈیات کی حکومت ہے۔ تمہیں کیا معلوم۔ کہ ہندوستان کی روحانیت کیسی بلند کیسی اعلیٰ ہے۔ وہاں ایک دفعہ جا کر دیکھو تو تمہاری آنکھیں کھل جائیں۔ وہاں سے واپس نہ آسکو گے۔

تم نے مغرب کی عورتیں دیکھی ہیں۔ جنہیں اپنے بناؤ سنگار ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ وہ اسے ہی زندگی کا ماحصل سمجھتی ہیں۔ اس سے پرے جانا ان کے لئے سراسر بیوقوفی ہے۔ مگر ہندوستانی عورت محبت کا دوسرا نام ہے۔ وہ اپنے شوہر کی اس طرح پرستش کرتی ہے۔ گویا وہ اس کا پر ماتا ہو۔ وہ اُس کی خاطر قن من دھن سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ اگر دنیا بھر کی بیاہی ہوئی عورتوں کو یکدم آزاد کر دیا جائے اور ان سے کہا جائے۔ کہ اب پھر سے اپنے اپنے لئے شوہر انتخاب کرو۔ تو مجھے یقین ہے۔ صرف ہندوستانی عورت ہی ایسی نکلے گی۔ جو اپنے پہلے ہی خاوند کی طرف دوڑے گی۔ ہم میاں بیوی کے رشتہ کو ماوری تعلق نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہمارے ملک میں ہاؤ ہزار ہا سال کی گراؤٹ اور غلامی کے عصمت و نسوانی پاکیزگی کی ایسی بلند اور حیرت ناک مثالیں نظر آتی ہیں۔ کہ سینا اور ساوتری کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ان خیالات سے میرے دل میں وطن کی محبت بیدار ہو گئی۔ سوچتا تھا۔ کیا سچ ہندوستان ایسا ملک ہے۔ بعض وقت طبیعت ایسی بیقرار ہوتی تھی۔ کہ میں چاہتا تھا۔ پر ملیں۔ تو اُس کر ہندوستان پہنچ جاؤں۔ اور دیو کی کے دعاوی کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھوں۔

دعویٰ

(۷)

اے بھائی! اس واقعہ کو دوہٹنے گزر گئے۔ میں اُداس اور رنجیدہ رہنے لگا تھا۔ اب لورپول کے بازاروں میں اور سمندر کے کنارے سیر کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ ذہن میں ہندوستان کا خیال سما چکا تھا۔ جس طرح سونا دیکھ کر پینٹل کے ٹکڑے آدمی کے دل سے اتر جاتے ہیں۔ اُسی طرح مجھے انگریزی تہذیب سے نفرت سی ہو گئی۔ سارے دن کمرے میں پڑا رہتا تھا۔ مگر شام کو دیو کی اور روپ چند آتے۔ تو طبیعت بہل جاتی تھی۔ اُن کو دیکھ کر دل میں وطن کی عظمت کا نقشہ کھنچ جاتا تھا۔

ایک دن سٹیلا کا خط آیا۔ لکھا تھا:-

مائی ڈیر ہیر سین!  
 تمہارے اُس دن کے حُسن سلوک نے مجھے موہ لیا ہے۔ میں سمجھ نہیں سکتی تمہارا شکر یہ کیسے ادا کروں۔ الفاظ میں یہ طاقت نہیں۔ میں نے سُن رکھا تھا۔ کہ ہندوستانی دیوتا سرشرت ہوتے ہیں۔ مگر اس پر اعتبار نہ آتا تھا۔ میں کہتی تھی۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ پرتم نے میرا خیال رد کر دیا۔ تمہاری محبت میرے دل میں ایسی پُر زور کبھی نہ تھی۔ اب وہاں کسی دوسرے کے لئے جگہ نہیں ہے اُس دن کے لئے تڑپ رہی ہوں۔ جب ہم دونو ہندوستان جائیں۔ اور وہاں کی زمین۔ کھیتیاں۔ پہاڑیاں

دریا- سبزہ- آسمان دیکھ کر محفوظ ہوں۔ اب میری صحت اچھی ہے  
والدین کی موت کا غم ہلکا ہو رہا ہے۔ کیا کسی روز تھیٹر نہ چلو گے ؟

ہمیشہ تمہاری سٹیلا

خط پڑھ کر پُرانی بیماری عود کر آئی۔ جس طرح شرابی شراب خانے  
کے سامنے پہنچ کر اپنے قول و قرار بھول جاتا ہے۔ سٹیلا کا نازنین  
چہرہ آنکھوں میں پھرنے لگا۔ میں بہت سوچتا تھا۔ مگر سمجھ نہ سکتا  
تھا۔ کہ سٹیلا نے چمک میں جھلسا زنی کیوں کی ؟ اس خط کی آخری  
سطروں نے معمہ حل کر دیا۔ سٹیلا کے والدین کا انتقال ہو چکا  
تھا۔ اب وہ یتیم تھی۔ بے یار و بے مددگار اُس کی شکل و صورت  
کیسی افسردہ معلوم ہوتی تھی۔ آنکھیں اندر کو گھس گئی تھیں۔  
جیسے مہینوں کی مریض ہو۔ میرا یہ خیال غلط نہ تھا۔ ایسی حالت  
میں اُس کا جرم جرم نہیں رہتا۔ آخر وہ کیا کرتی۔ لیکن اگر مجھ سے  
تمام حالات بلا کم و کاست بیان کر دیتی۔ تو یہاں تک نوبت نہ  
پہنچتی۔ گزرے ہوئے دن پھر واپس آگئے۔ فضول خرچیوں کا  
دور چلنے لگا۔ اب پھر وہی سٹیلا تھی۔ وہی میں تھا۔ اور وہی  
لگا ہیں تھیں۔

ایک دن میں نے کہا ”سٹیلا! روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔

کیا کرینگے؟“

سٹیلا نے میرے کوٹ کا بٹن دباتے ہوئے پوچھا: کتنا روپیہ

باقی ہے۔ ذرا بنک کی کتاب دیکھو۔  
 میں نے کتاب دیکھ کر جو ابدیا صرف سو سو پونڈ باقی ہیں؟  
 ”ڈیر! ذرا فکر نہ کرو۔ میرا چچا سخت بیمار ہے۔ کوئی دن میں  
 مَر جائے گا۔ لاکھوں کا مالک ہے۔ اُسکی ساری جائیداد مجھے ملے گی؟  
 یاس میں اُمید کی کرن دکھائی دی۔ میں نے کرسی آگے  
 سرکالی اور حریر صاف نگاہوں سے اُس کی طرف تاکتے ہوئے  
 بولا: تمہیں اپنا عہد یاد ہے؟“  
 ”اُسے دل کی گرہ سمجھو۔“

”روپیہ پا کر بدل تو نہ جاؤ گی؟“  
 ”میں ایسی کم ظرف نہیں۔“

”روپیہ بُری چیز ہے۔ یہ اچھے اچھوں کو گمراہ کر دیتا ہے۔“  
 ”پر تمہاری محبت روپیہ سے کہیں بیش قیمت ہے۔ اُس کے  
 سامنے دُنیا بھر کے سونے کی کوئی حقیقت نہیں۔“

اتنے میں ایک لڑکا اور پول ٹامبوکا تازہ پرچہ لے کر آیا۔ او  
 میز پر رکھ کر چلا گیا۔ میں نے اُسے اٹھاتے ہوئے پوچھا: تو  
 بڑھا تک مَر جائیگا؟“

”بہت جلد۔ شاید دو چار دن نکالے۔“

اتنے میں اخبار کے پہلے صفحہ پر میری نگاہ گئی۔ میں زمین  
 سے اُچھل پڑا۔ کلچر لبوں تک آ گیا تھا +

# مِسٹر کراس وُڈ کا انتقال

آخری الفاظ

ساری جائداد میری سٹیلا کے نام

جب اخبار پریس میں جا رہا تھا۔ تو ہمیں اطلاع وصول ہوئی۔ کہ لورپول کی مشہور ڈکان پیپلز شاپ کے پروپرائیٹر مسٹر کراس وُڈ کا انتقال ہو گیا ہے۔ مدوح کچھ عرصہ سے بیمار تھے۔ لیکن یہ خیال نہ تھا۔ کہ وہ اتنی جلدی مَر جائیں گے۔ مرحوم نے اپنی ساری جائداد اپنی یتیم بھتیجی میری سٹیلا کے نام لکھ دی ہے۔ جو آجکل کس مپرسی کی حالت میں ہے۔ مرحوم کی زبان پر آخری لمحوں میں اپنی بھتیجی کا نام تھا:

میں نے اخبار سٹیلا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اُس وقت میں ایسا خوش تھا۔ جیسے وہ جائداد مجھی کو ملی ہے۔ سٹیلا کی آنکھیں فرط مسرت سے چمکنے لگیں۔ چہرے پر مسکراہٹ کا رنگ جھلک رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اور اپنے لمبے قد کو اور بھی لمبا کر کے بولی میرا خیال بالکل ٹھیک نکلا۔ اب ہم غریب نہیں ہیں! یہ کہتے کہتے اُس نے میری طرف آنسو بھری آنکھوں سے

دیکھا اور ٹوپی پہن کر باہر نکل گئی۔ شوق نے پاؤں میں تیر لگا دئے تھے۔ میں آرام کر سہی پر لیٹ گیا۔ اور آنکھیں بند کر کے اپنے مستقبل کا نقشہ بنانے لگا۔ سوچتا تھا۔ جب سٹیلا کا مجھ سے بیاہ ہوگا۔ تو لوگ چونک اٹھیں گے۔ اخبارات میں شور مچ جائیگا۔ کئی امیر زادے منہ کھولے کھڑے ہیں۔ سب کے سب مایوس ہو جائیں گے۔ کہیں گے۔ ایک ہندوستانی انگریزوں کو شکست دے گیا۔ میری باچھیں کھلی جاتی تھیں ۛ

شام کو روپ چند اور دیوکی آئے۔ تو میں نے یہ خوشخبری انہیں سنائی۔ مگر انہوں نے اعتبار نہ کیا۔ بولے تم سادہ لوح ہو۔ مغرب میں رہے ہو تو کیا ہو۔ تمہاری فطرت تو نہیں تبدیل ہو سکتی۔ سٹیلا جب غریب تھی۔ تمہاری تھی۔ اس سے اُسے فائدہ تھا۔ مگر اب وہ امیر ہے اُس کے کئی امیر زادے ہم قوم اُس سے بیاہ کرنے کو تیار ہونگے۔ اب اُسے تمہاری کیا پروا ہے۔ دیکھ لینا۔ وہ صاف بدل جائیگی ۛ

انسان جسے چاہتا ہے۔ جس پر اعتماد کرتا ہے۔ اُس کے خلاف نہیں سن سکتا۔ مجھے اُن پر بے حد غصہ آیا۔ روکھاٹی سے بولا۔ مجھے اُس سے یہ امید نہیں ۛ

روپ چند سمجھ گئے۔ اسوقت کسی بات کا اثر نہ ہوگا۔ پاگل اور عاشق کو نصیحت ایسی بُری لگتی ہے۔ جیسی تیز کشاری۔ بلکہ

اس سے بھی بُری۔ اُنہوں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ مگر آج مجھے اُن کی باتیں اچھی معلوم نہ ہوئیں۔ کبھی اُنہیں سُن کر روح سرشار ہو جاتی تھی۔ میں نے اخبار ہاتھ میں لے لیا۔ اور اُسے دیکھنے لگا۔ کسی کو ٹالنے کا یہ مہذبانہ طریق ہے۔ روپن چند اور دیو کی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے کہا: اتنی جلدی؟

مگر دل دھڑک رہا تھا۔ کہ کہیں بیٹھ نہ جائیں؟

دیو کی نے جواب دیا: دل میں خوش ہو رہے ہو گے؟

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ مگر مہنس کر چُپ ہو رہا۔ وہ دو

چلے گئے۔ تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مجھے امید تھی۔ کہ

سٹیلا آ رہی ہوگی۔ میں آدھی رات تک دروازے بس کھڑا رہا۔

مگر وہ نہ آئی۔ تب خیال آیا۔ آج دیر ہو گئی ہے۔ کل آئیگی۔

رات کو یہی خواب آتے رہے۔ دن ہوا۔ اُمید نے پھر دروازے

میں کھڑا کر دیا۔ کوئی موٹر آتا۔ تو شبہ ہوتا ہے۔ وہی آ رہی ہے

کوئی آواز سُنتا۔ تو سمجھتا۔ وہی ہوگی۔ مگر وہ نہ آئی۔ اسی طرح

سارا دن گزر گیا۔ میرے پاؤں دُکھنے لگے۔ مایوس ہو کر اندر

چلا گیا اور کرسی پر گر پڑا۔ مگر ابھی اُمید باقی تھی۔ لگا میں نے

کی طرف جھی رہیں۔ یہاں تک کہ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔

اور ہٹل کے ملازم نے صدر دروازہ بند کر لیا۔ یہ گویا میری

اُمید کا دروازہ تھا۔ جو بند ہو گیا۔ سوچنے لگا۔ کیا وجہ ہے؟

جو وہ آج بھی نہیں آئی۔ اب مجھے اُس پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ کہیں دولت پا کر مجھے بھول تو نہیں گئی۔ اگر یہی بات ہے تو میں اُس کا مُتہ بھی نہ دیکھوں گا۔ روپیہ پا کر مغرور ہو گئی ہے۔ مگر اُسے معلوم ہونا چاہئے کہ میں بھی غریب نہ تھا۔ میں نے اپنی دولت اُسی پر قربان کی ہے۔ سنبھال کر رکھنا۔ تو اُس جیسی سینکڑوں خرید سکتا تھا۔ پھر خیال آتا۔ نہیں۔ اُسے مجھ سے دراصل عشق ہے وکیلوں سے مشورہ کر رہی ہوگی۔ دُکان کی دیکھ بھال میں مصروف ہوگی۔ وقت نہیں ملا۔ ورنہ بھائی بھائی جلی آتی ۞

اسی اُمید ویم میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ مگر وہ نہ آئی۔ اب مجھے یقین ہو گیا۔ کہ میری اُمیدوں کے شجر بے ثمر رہیں گے۔ دل کو صبر کی تلقین کرنے لگا۔ جس طرح کوئی اپنے عزیز رشتہ دار کی موت پر دل کو سمجھاتا ہے۔ مگر اُس کا خیال بھولتا نہ تھا۔ مجھے وہ رہ رہ کر یاد آتی تھی۔ جس طرح مرے ہوئے عزیز کا خیال باسانی دل سے نہیں جاتا۔ اچانک ایک دن ایک آدمی نے آکر رقعہ دیا۔ لکھا تھا۔

”اسی وقت آؤ۔ دروازے میں کھڑی ہوں۔ سٹیلا“۔

(۸)

لے بھائی! مجھ پر کیفیت کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اُس وقت

میں زمین پر تھا۔ مگر میرے خیالات آسمان میں اُڑ رہے تھے۔ اسی دم سٹیلا کے مکان پر پہنچا۔ وہ عین تھی۔ اُسے بیٹے سینکڑوں فعدے دیکھا تھا۔ مگر اس امیرانہ لباس میں وہ پُری معلوم ہوتی تھی آج اُس کا حسن پھٹا پڑتا تھا۔ وہ سچ محج میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کے لبوں پر

مُسکراہٹ آگئی۔ میرے دل میں غصّہ بھرا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ جاتے ہی شکووں کا دفتر کھول دوں گا۔ مگر اس مُسکراہٹ کی رو میں غصّہ اور شکوے اس طرح بہ گئے۔ جس طرح دریا کے تیز دھارے میں کاغذ اور تینکے بہ جاتے ہیں۔ میرے ہونٹ بند ہو گئے۔ مگر سٹیلا خاموش نہ رہی۔ میری طرف توجّھی ہوئی سے دیکھ کر بولی: ”مجھے آپ سے بید گلہ ہے“

اب میری زبان کو بھی قوت گویائی ملی۔ میں نے کہا: ”مجھے خاموش دیکھ کر آپ کو حوصلہ ہو گیا“

”آپ نے میری بات تک نہ پوچھی۔ بڑے بے درو ہو“

”یہ مجھ سے نہ پوچھو اپنے دل سے پوچھو“

”مگر آپ آئے کیوں نہیں؟ کیا اتنا بھی خیال نہ تھا۔ کہ چل کر

دیکھوں تو سہی۔ غریب پر کیا گزری ہے“

”اب غریب ہم ہیں۔ آپ کی تو قسمت کھل گئی“

”یہ طعنے بازیاں اچھی نہیں لگتیں“

میں نے سگار سلگا کر جواب دیا: ”اب جو کہو۔ سب سچ ہے“



ہو گیا۔ جسم میں طاقت نہ رہی۔ سوچنے لگا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس وقت تک سیٹلا بیٹھی تھی۔ یکا یک کھڑی ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ جس طرح بھولا ہوا مسافر ستہ بل جانے سے خوش ہو جاتا ہے۔ اُس نے انگلی سے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ اور میرے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا دے کر کہا: اندر چھپ جاؤ۔ موقعہ پا کر بچھلی طرف کا دروازہ کھول کر نکل جانا۔ مجھ سے اس وقت کچھ نہ پوچھو۔ میرے ہوش ٹکانے نہیں ہیں۔ مفصل پھر کہو گی۔“

یہ کہتے کہتے اُس نے مجھے اندر جھکیں دیا۔ اور باہر سے تالا لگا دیا۔ میں ڈرے ہوئے بچے کی طرح سہم گیا۔ زبان سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ جس طرح سوئے ہوئے آدمی کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا جائے تو وہ بیدار ہونے پر اپنے آپ کو موت کی گرجتی ہوئی لہروں کے آغوش میں دیکھ کر سرا سیمہ ہو جاتا ہے۔ اُسی طرح میں پریشان و ششدر ہو رہا تھا۔ آنا فنا یہ ہو جائیگا یہ امید نہ تھی۔ عشق کو پھولوں کی سیج سمجھ کر آیا تھا۔ کاش پہلے سوچا ہوتا کہ اس میں کانٹے بھی ہونگے۔ پھول دیکھ چکا تھا۔ اب کانٹوں کی باری تھی۔ چند ہی منٹ کے بعد جی گھبرانے لگا۔ جیسے یہاں برسوں سے بند ہوں۔ خواہش ہوئی دروازہ توڑ کر نکل جاؤں۔ باہر کوئی گاتا ہوا جا رہا تھا

اُس کی حالت پر رشک آیا۔ کتنا خوش نصیب ہے۔ جہاں چاہتا ہے جاتا ہے۔ پتہ نہیں کون ہے۔ مگر اُسے کوئی ڈر، کوئی خوف، کوئی اندیشہ نہیں۔ آزادی کی قدر آزادی کھو کر معلوم ہوئی۔ حالانکہ صرف گھنٹے دو گھنٹے کا سوال تھا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور آزادی کے لمحے کا منتظر ہوا۔ اتنے میں کسی نے کہا: میں واپس آگئی۔ وکیل نے مجھے تار دیا تھا: ”آواز کسی بڑھیا کی معلوم ہوتی تھی +

”سٹیٹانے جواب دیا: کوئی اہم بات ہوگی۔ ورنہ وہ تار ہرگز نہ دیتا:“

”ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ میری واپسی سے تم ناخوش تو نہیں ہوئی:“

”تمہیں میری سعادت مندی پر رشک ہے کیا؟“

”نہیں۔ یونہی پوچھا تھا:“

”ایسے سوال سن کر مجھے آگ لگ جاتی ہے:“

”تو ب! پھر نہ پوچھو گی۔ ذرا سامنے کے کمرے کی چابی دینا:“

میرے بدن سے پسینہ چھوٹنے لگا:۔

”کیا کرو گی؟“

میرا ناٹ گون اندر ہے:۔

سٹیٹانے جواب دیا: تم تھکی ہوئی ہو۔ آرام کرو۔ میں نکال

لائی ہوں“

”نہیں۔ تکان کا ہے کی۔ کونسا پیدل سفر کیا ہے؟ جو پاؤں  
نہیں اٹھتے“

”پھر بھی بڑھی ہو۔ زینے چڑھتے چڑھتے ہی دم پھول جاتا،  
میں یہ نہیں دیکھ سکتی“

مگر بڑھی نے نہ مانا۔ چابی لے کر دروازے کی طرف چلی۔  
میرا دم رکنے لگا۔ چایا۔ کہ اٹھ کر پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر کل  
جاؤں مگر پاؤں نے جواب دیدیا۔ اٹھنے کی ہمت نہ رہی۔ بڑھی دروازہ  
کھول کر اندر آگئی۔ میں ایک کونے میں چھپا ہوا تھا مگر اُس کی  
نگاہ مجھے پر پڑ گئی۔ ہونہار کو ٹالنے کی طاقت کس میں ہے۔  
اُس نے زور سے چیخ ماری۔ اور چلا کر کہا: چور“

میرا خون جم گیا۔ حالات ایسی خوفناک شکل اختیار کر لینگے  
یہ خواب میں بھی خیال نہ تھا۔ سیٹلا کو بچاؤ کا طریقہ سوچھ گیا۔  
وہ بھاگ کر باہر نکل گئی۔ اور زور سے چلانے لگی۔ چور۔ چور“  
یہ سن کر میں اس طرح چونک پڑا۔ جیسے آستین سے سانپ  
نکل آیا ہو۔ میں نے سیٹلا کی طوطے چشمی، بیوفائی، جلسا سازی  
دیکھی تھی۔ مگر اُس سے یہ اُمید نہ تھی۔ کہ اپنی عزت کے منہج پر  
میرے بھینٹ چڑھا کے گی۔ میرے پاؤں من من کے بھاری  
ہو گئے بت کی طرح کھڑا رہ گیا۔ اتنا بھی نہ ہو سکا۔ کہ چاہیوں کا

گچھا ہی پھینک دوں۔ اتنے میں پولیس کے ایک سپاہی نے  
 آکر مجھے گرفتار کر لیا۔ میں دو گھنٹے کی اسیری سے گھبرا رہا تھا۔  
 اب کئی سالوں کی قید سامنے تھی۔ مگر مجھے پروا نہ تھی۔ انسان  
 کی احسان فراموشی نے قید کی ذلت اور شدت کو کم کر دیا تھا۔  
 بعد میں معلوم ہوا۔ کہ وہ بڑھیا سٹیلا کی موسیٰ تھی اور سٹیلا  
 کے چچا وصیت میں لکھ گئے تھے۔ کہ سٹیلا کو اُس کی مرضی پر  
 چلنا ہوگا۔ سٹیلا نے اُس کی ناراضگی کا خیال کیا۔ مگر میرا  
 خیال نہ کیا۔



(۹)

اے بھائی! مجھ پر مقدمہ چلانے کی خبریں کو ایک مضمون مل گیا  
 جلی حروف کی سرخیاں دے دے کر خبریں چھاپنے لگے۔ کوئی  
 مجھے مہذب چور لکھتا تھا۔ کوئی ہندوستانی دیوا لہ۔ بعض  
 اخبارات نے تو یہاں تک لکھ دیا۔ کہ میرا پیشہ ہی یہ ہے سٹیلا  
 پر نامہ نگاروں نے یورش کی۔ اُس نے اپنی عزت بچالی۔  
 مگر مجھے بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ کہا۔ کہ  
 میں اس انڈین سنس بالکل ناواقف ہوں۔ میں نے اُسے  
 اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے وہ محض چوری  
 کے ارادہ سے میرے مکان میں داخل ہوا تھا۔ اُس کا اور  
 مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے یہ سنا۔ تو پاؤں کے نیچے

سے زمین نکل گئی۔ سزا کا یقین ہو گیا۔ میں نے اپنے انگریز دوستوں کو رو رو کر لکھا۔ کہ میری امداد کرو۔ پر کسی نے جواب نہ دیا۔ لیکن روپ چند اس آٹے وقت میں کام آئے۔ اور مجھے ضمانت پر رہا کر کے لے گئے۔ اس کے بعد میں نے کئی دن تک انہیں آرام سے بیٹھے نہیں دیکھا۔ دن رات میرے مقدمہ کی تیاریوں میں لگے رہتے تھے۔ اُن کے جوش انہماک کو دیکھ کر مجھے شبہ ہونے لگتا تھا۔ کہ مقدمہ میرا نہیں اُن کا اپنا ہے۔ وہی شہادتیں بنا رہے تھے۔ وہی صفائی تیار کر رہے تھے۔ وہی کاغذات مرتب کرتے تھے وہی وکیلوں کے پاس جاتے تھے۔ اُن کی سرگرمیوں نے مجھے بے پروا بنا دیا۔ مین سارے دن دیوکی کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ تب مجھے اُس کی رُوحانی عظمت کا احساس ہوا۔ اُسے میں نے کبھی میری کوہلی ریٹائلڈس۔ وکٹر ہیوگو یا ایگنر نیڈر ڈوما کے ناول پڑھتے نہیں دیکھا۔ وہ انہیں قطعاً پسند نہ کرتی تھی۔ وہ رامائن اور گیتا پڑھتی تھی۔ ان کتابوں میں ریٹائلڈس کے ناولوں کی سی پیچیدگیاں نہیں۔ نہ ڈوما کے سے نشیب و فراز ہیں۔ مگر ان میں انسانی زندگی کے ایسے پاکیزہ اور بلند معراج دکھائے گئے ہیں۔ کہ میں سُن کر اچھل پڑا۔ مجھے لوگ کتابوں کا کپڑا کہتے ہیں۔ دن رات پڑھتا رہتا ہوں۔ مگر رامائن سُن کر مجھے

ایسا معلوم ہوا۔ کہ میں نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔ مغرب کے تمام  
 لٹریچر کو اس اکیلی کتاب سے وہی نسبت ہے۔ جو ایک حقیر  
 ذرے کو آفتاب عالمتاب سے ہے۔ میں انگریزی کے تمام ہنرمیں  
 مصنفوں کی بہترین کتب کو اس تنہا کتاب پر قربان کر سکتا ہوں  
 مجھے یہ اُمید نہ تھی۔ کہ ہندوستان میں ایسی کتابیں بھی ہیں۔  
 دیوکی کو سینٹا کیریکٹر بہت اپیل کرتا تھا۔ اُس کا نام سُن کر  
 اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ اور وہ صرف پڑھتی  
 نہ تھی۔ جو کچھ پڑھتی تھی۔ اُسے اپنی زندگی میں جذب بھی کرتی  
 تھی۔ وہ نہایت حلیم۔ شیریں مزاج۔ پاک دل۔ نیک فطرت  
 اور شریف عورت تھی۔ اُسے دیکھ کر مجھے ہندوستان پر غور  
 ہونے لگتا تھا۔ اُس نے مجھے کبھی گزشتہ افعال پر تنبیہ نہیں کی۔  
 کبھی میرے اغلاط کا ذکر نہیں کیا۔ وہ اس بات کو تہذیب سے  
 گرا ہوا سمجھتی تھی۔ میں اُس کے جتنا قریب ہوتا تھا۔ اتنا ہی وہ  
 مجھے زیادہ نیک، پاکیزہ معلوم ہونے لگی۔ جی چاہتا تھا اُسکے  
 قدموں سے لپٹ جاؤں۔ ————— وہ عورت نہیں یوی تھی  
 اُس کی مادرانہ شفقت پر میرا دل لوٹ پلوٹ ہو گیا۔  
 اے بھائی! مقدمہ کا فیصلہ ہوا۔ روپ چند کی کوششیں  
 ثمرور ثابت ہوئیں۔ میں رہا ہو گیا۔ اور اتنا ہی نہیں سیٹلا پر  
 اُلٹا مقدمہ چلا۔ اُس نے ایک شریف آدمی کی توہین کی تھی

اُسے پچیس پونڈ جرمانہ ہوا۔ یہ پچیس پونڈ میری عزت کی قیمت تھی۔ میں نے روپ چند کا شکریہ ادا کیا۔ اُس کے ساتھ میرا کوئی رشتہ نہ تھا۔ کوئی تعلق نہ تھا۔ اُس نے صرف ہندوستانی ہونے کے باعث مجھ پر احسان کیا تھا۔ یہ رشتہ دوستی اور خون کے رشتہ سے بھی مضبوط ہے۔ یہ وطن کا رشتہ ہے +

میرے دل میں خاوندی ہوی دونو کے لئے احترام نے جگہ لے لی۔ میں ایک کو دیتا سمجھتا تھا۔ دوسرے کو دیوی۔ میں اپنے خانہ دل میں اُن کی پوجا کرتا تھا۔ انسان اتنا بے غرض۔ اتنا شریف۔ اتنا نرم دل ہو سکتا ہے۔ اس کی مجھے توقع نہ تھی۔ اُنہیں بازار میں جاتے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے گاؤں میں دورانج ہنس جا رہے ہوں۔ میرے تعلقات اُنکے ساتھ بڑھنے لگے۔ پہلے وہ میرے پاس آیا کرتے تھے۔ اب میں اُن کے ہاں جانے لگا۔ اگر ایک دن بھی نہ جاتا۔ تو طبیعت خراب ہو جاتی۔ جیسے کسی ضروری فرض کو ادا نہ کیا ہو۔ اور یہ صرف میرا ہی حال نہ تھا۔ وہ بھی مجھے گھر کا آدمی سمجھنے لگے تھے اور ہر امر میں مجھ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ ایک دن میں اوڈیو کی سیر کو گئے۔ آسمان پر بادل لہرا رہے تھے۔ دیو کی بار بار آسمان کی طرف دیکھتی تھی۔ اُس کو اندیشہ تھا۔ کہ کہیں بارش نہ ہونے لگے۔ مگر مجھے اس کی پروا نہ تھی۔ ہم نے ایک کشتی گراہ پر چلی

اور سمندر کی سیر کرنے لگے۔ دیو کی اسوقت بھی ہچکچا رہی تھی مگر اُس نے اپنا عندیہ مجھ پر صاف صاف ظاہر نہیں کیا۔ شائد اُس کو خوف تھا۔ کہ میں خفانہ ہو جاؤں۔ کشتی سمندر کی لہروں پر ناچتی ہوئی آگے بڑھی۔ ہم پانی کا تماشہ دیکھنے میں محو ہو گئے۔ اس حالت استغراق میں کتنا وقت گزر گیا۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہم ساحل سے بہت فاصلے پر آگئے تھے۔ معاً بارش شروع ہو گئی۔ اس بارش نے ہم پر وہی اثر کیا۔ جو پانی کے چھینٹے لہری نیند میں غافل سونے والوں پر اثر کرتے ہیں۔ ہم چونک پڑے کنارے کی طرف نگاہ گئی۔ تو کلیجہ سن سے ہو گیا۔ سوچنے لگے۔ اب کیا ہوگا۔ ہوا زور زور سے چل رہی تھی۔ اور ملاح کی تمام کوشش سعی بے سود ثابت ہو رہی تھی اُس کے کئے کچھ بنتا نظر نہ آتا تھا۔ سمندر کی خوفناک لہروں کے سامنے اُس کی کچھ پیش نہ جاتی تھی۔ میں گھبرا گیا۔ مگر دیو کی کے چہرے پر تسکن نہ تھا۔ وہ اسوقت بھی ایسی ہی خوش تھی۔ جیسے اپنے مکان میں بیٹھی ہو۔ مجھ سے بولی۔ ”اب گھبرانے سے کیا ہوگا۔ جو ہوتا ہے دیکھتے چلو۔ اور پر ماتما پر بھروسہ رکھو“۔

میرے دل میں تیر سا چبھ گیا۔ خیال آیا یہ عورت ہے مگر پھر بھی طوفان کے دھارے میں مطمئن بیٹھی ہے۔ میں مرد ہوں۔ مگر روح لرز رہی ہے۔ اس کی تہہ میں کیا بات کام کر رہی ہے۔

صرف یہ کہ اُسے پر ماتما پر بھروسہ ہے۔ مجھے نہیں۔ اے بھائی  
اس پہلو میں مغرب پر ماتما کی ہستی سے مُنکر ہے۔ مغرب کا باشنہ  
اپنے زور بازو پر بھروسہ کرتا ہے اور بعض حالتوں میں پر ماتما  
کو لٹکار بیٹھتا ہے۔ مگر اُس پر بھروسہ نہیں کرتا۔ وہ اُسے حماقت  
تصور کرتا ہے۔

کشتی بچکورے کھانے لگی۔ میرا دل بھی اسی طرح بچکورے  
کھا رہا تھا۔ دیو کی نے اپنے آپ کو پر ماتما کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا  
مگر مجھ میں یہ طاقت نہ تھی۔ میں پانی کی طرف اور اُس کی موت  
سے بھی زیادہ خوفناک موجوں کی طرف دیکھتا تھا۔ اور کانپتا  
تھا۔ یکایک ایک لہر نے کشتی کو اُلٹ دیا۔

(۱۰)

اے بھائی! اب ہم موت کے مُنہ میں تھے۔ مگر میں نے حوصلہ  
نہیں ہار دیا میں سمندر کی دیوانی لہروں کے ساتھ کشمکش  
کرنے لگا۔ مجھے اتنا اپنا خیال نہ تھا۔ میں چاہتا تھا۔ کسی طرح  
دیو کی بچ جائے۔ اُس کے اور اُس کے خاوند کے احسان میرے  
سامنے آگئے تھے۔ میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ مگر دیو کی کہیں  
دکھائی نہ دی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ دُور دُور تک  
نگاہ دوڑائی۔ پر اُس کا پتہ نہ لگا۔ میں مایوس ہو گیا۔ معاً کوئی  
چیز میری طرف آتی دکھائی دی۔ میری خوشی کا ٹکنا نہ تھا۔ یہ

دیو کی تھی۔ میں اُس کی طرف بڑھا۔ اور اُسے ایک ہاتھ سے پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے پانی کو کاٹتا ہوا کنا سے کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن وہاں تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ میرا دم پھول گیا۔ ہاتھ پاؤں میں سکت نہ رہی۔ اٹھاہ ساگر کی طرف دیکھ کر دل بیٹھ جاتا تھا۔ مگر دیو کی کا خیال ہمت بندھائے جاتا تھا۔ موت اور زندگی پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔ میں ہاتھ مارتا گیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ میری کوششیں کبھی کامیاب نہ ہوں گی۔ دفعتاً میں نے دیکھا۔ کنارہ قریب ہی ہے۔ مردہ جسم میں جان آگئی۔ ٹوٹا ہوا حوصلہ بندھ گیا۔ میں نے اپنے جسم و روح کی انتہائی قوتیں صرف کر دیں۔ اور دیو کی کو لے کر کنارے پر چڑھ گیا۔ اے بھائی! ہم موت کے منہ سے بچ گئے تھے۔ مگر ابھی طوفان فرو نہ ہوا تھا۔ میں پناہ کی جگہ ڈھونڈنے لگا۔ دیو کی کو ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے میں چاروں طرف دوڑ رہا تھا۔ ہاتھ تھک چکے تھے۔ پاؤں چلنے سے جواب دے چکے تھے۔ مگر میں پھر بھی چل رہا تھا۔ یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ آخر اک پرانے وقتوں کا جھونپڑا مل گیا۔ اس جھونپڑے کے در و دیوار خستہ ہو چکے تھے فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ مگر اس طوفان باد و باران کے موقع پر یہ جھونپڑا قصر شاہی سے کم نہ تھا۔ میں بے تحاشا اندر گھس گیا۔ ایک طرف گھاس کے انبار لگے تھے۔ میں نے اُسے

زمین پر پہنچا کر ایک گدگدا بستر تیار کیا۔ اور اُس پر دیو کی کے  
بلے ہوش جسم کو لٹا دیا +

بارش ہو رہی تھی۔ بیں جھونپڑے سے باہر نکلا۔ اور گرتے  
پڑتے ساتھ کے گاؤں میں پہنچا۔ یہاں سے کچھ دوو خرید۔  
کچھ ڈبل روٹیاں۔ کوٹلوں اور کبلوں کے لئے روپے دے آیا۔  
مزدوروں نے یہ سب سامان جھونپڑے میں پہنچا دیا۔ اب یہ  
ایک دہقان کا گھر بن گیا تھا۔ میں نے چائے تیار کی اور دیو کی  
کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ اُس کے چہرے کا رنگ اٹرا ہوا تھا۔ آنکھوں  
سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ جیسے بھی  
ہوسکے۔ روپ چند کے پاس پہنچ جائے۔ مگر بارش نے رستہ  
روک رکھا تھا۔ حتے کہ تین دن گزر گئے اور تب جا کر بارش  
تھمی۔ میں نے گاؤں میں جا کر ایک گاڑی کا انتظام کیا اور  
دیو کی کو لے کر لورپول کی طرف روانہ ہوا +

رستہ میں دیو کی بولی : ” وہ مجھ سے بچد ناراض ہو رہے ہونگے“  
” مگر اس میں تمہارا قصور کیا ہے؟ اس غضب کے طوفان



میں باہر نکلنا آسان نہ تھا +

گھبرا رہے ہونگے +

” اب جلد پہنچ جاؤ گی +

” بغیر اجازت لئے نکل آتی تھی۔ آئندہ کے لئے کان ہو گئے +

اس کا میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ دل میں سوچنے لگا۔ روپ چند کو کچھ شبیہ تو نہ ہو جائیگا۔ دیو کی تین دن میرے پاس رہی ہے اور اکیلی۔ شہر سے باہر ایک جھونپڑے میں۔ ایسی حالت میں شبہات پیدا ہو جانا تعجب خیز نہیں۔ اگر روپ چند کے دل میں کوئی خیال جم گیا۔ تو دیو کی کی زندگی تباہ ہو جائیگی۔ وہ اسے برداشت نہ کر سکے گی۔ میں تذبذب میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا۔  
 ”جب وہ پوچھیں گے۔ کہاں رہی ہو۔ تو کیا کہو گی؟“  
 ”جو کچھ امر واقعہ ہے؟“

میں چونک پڑا۔ میں اُس کے مُنہ سے یہ جواب سُننے کے لئے تیار نہ تھا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر کسی غیبی طاقت نے میری زبان پکڑ لی۔ شائد مجھے اپنی پاکیزگی پر وہ اعتبار نہ تھا جو دیو کی کو اپنی پاکیزگی پر تھا میں نے آہستہ سے کہا یہ شائد یہ کہنا خلاف مصلحت ثابت ہو؟

دیو کی اپنی جگہ سے اُچھل پڑی۔ جیسے کسی نے اُس کے کان کے پاس بندوق چلا دی ہو۔ اُس کا چہرہ تپے ہوئے لُوہے کے مانند سُرخ ہو گیا۔ گھبرا کر بولی ”کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ وہ مجھ پر شک کرنے لگیں گے؟“

”پر قسمتی سے حالات ایسے ہو گئے ہیں۔ کہ وہ شک کر سکتے ہیں؟“  
 ”مگر مجھے یہ امید نہیں ہے۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں؟“



موقعہ تھا۔ ضمیر نے گھوڑے کے مانند سرکشی کر رہا تھا۔ کچھ دیر تک یہ کشمکش رہی۔ اس کے بعد مصلحت غالب آگئی۔ دیوکی نے میری تجویز منظور کر لی۔ اور اپنے مکان کے پاس پہنچ کر گاڑی سے اتر گئی میں اپنے ہوٹل کو چلا آیا۔

(۱۱)

لے بھائی! روپ چند گھبرائے ہوئے تھے۔ دیوکی کو پا کر انہیں ایسی خوشی ہوئی۔ جیسے کسی کا ڈوبا ہوا دھن مل جائے۔ انہیں دیوکی کے قول پر ذرا بھی شبہ نہ ہوا۔ انہیں یہ خیال بھی نہ تھا۔ کہ دیوکی ان سے دغا کر سکتی ہے۔ اُس کی بات سن کر انہوں نے اور کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ کامل طور پر مطمئن تھے۔ مگر دیوکی کا اطمینان اور قرار دو نو رخصت ہو گئے۔ وہ ہر وقت اُداس رہنے لگی۔ سوچتی تھی۔ میں نے اُن سے کیوں جھوٹ بولا۔ اُس کے الفاظ میں اپنی سہیلی کیتھرائن نانسی کے ہاں تھی۔ ہر وقت اُس کے دماغ میں گناہ کی یاد کے مانند ڈنک مارتے رہتے تھے۔ وہ چاہتی تھی۔ کسی طرح یہ الفاظ واپس لیں۔ مگر اکٹھ سے گرا ہوا آنسو، اور قفس سے چھٹا ہوا پرندہ کہاں لوثتا ہے۔ وہ اکثر مجھ سے کہتی۔ جی چاہتا ہے۔ اُن کے پیروں سے پیٹ کر اپنے گناہ کا اقبال کر لوں۔ اُن کا سینہ درد کا سوتا ہے مجھے فوراً معاف کر دیجئے۔ مگر میں نے ہر بار اُس کے ارادہ کو

دبا دیا۔ کہا۔ اب یہ غلطی مُملک ہوگی۔ اُنہیں ضرور شبہ ہو جائیگا۔ یہ شبہ تمہاری خوشی اور زندہ دلی کو اس طرح نکل جائیگا۔ جس طرح طوفانی ندی کی گرجتی ہوئی لہریں سب سبز و شاہاب کھیتوں کو نکل جاتی ہے۔ جن چلا جاتا ہے۔ پر ظن نہیں جانا۔ اب سوچنا ہوں۔ تو کہتا ہوں۔ میں نے اُسے یہ رائے کیوں دی۔ مگر غلطی کا یہیں پر خاتمہ نہیں ہو گیا۔ بسا اوقات ہماری بات چیت کے مابین روپ چند اندر آجاتے۔ میں اور دیو کی دونوں ناڑی تھے ہم نے جھوٹ بولا۔ مگر اُسے اختتام تک پہنچانے کے اہل نہ تھے۔ روپ چند کو دیکھ کر ہم اس طرح خاموش ہو جاتے۔ جیسے چور اپنی چوری کو چھپاتا ہے۔ اس وقت دیو کی سہمی ہوئی نگاہوں سے اپنے خاوند کی طرف دیکھتی اور آنکھیں نیچے جھکا لیتی چہرے کے جذبات چھپانا آسان ہے۔ مگر نگاہیں چھپانا آسان نہیں۔ ان نگاہوں نے کام خراب کر دیا۔ روپ چند کو شبہ ہونے لگا۔

مگر یہ شبہ شبہ ہی نہ رہا۔ یقین کی حد تک پہنچ گیا۔ ایک دن بازار میں کیتھرائن نانسی اور روپ چند سے ملاقات ہو گئی۔ کوئی آدھ گھنٹہ تک باتیں ہوتی رہیں۔ گھر آئے۔ تو ناگ کے مانند پھنکاریں مار رہے تھے۔ اس وقت اُن کے نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے آگ کے شرارے نکلتے تھے۔ دیو کی کئی دُور

جا کر شہر بار لہجہ میں بولے "دیو کی! مجھے تجھ سے یہ اُمید نہ تھی۔ میں تجھے دیوی سمجھتا تھا۔ اور تیری قسم کھاتا تھا۔ میں کہتا تھا۔ سب کچھ ہو سکتا ہے یہ نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ خیال نہ تھا۔ کہ عورت پر اعتبار کرنا انتہا درجہ کی حماقت ہے۔ تو نے میری آنکھیں کھلی ہیں" جس طرح زہریلے ناگ کے زہر کا اثر آن واحد میں مار گزریا کے خون میں سرایت کر جاتا ہے۔ اُسی طرح روپ چند کے ان الفاظ کا اثر دیو کی کے خون میں سرایت کر گیا۔ وہ کچھ بول نہ سکی۔ صوف سے اُٹھی مگر لڑکھڑا کر گر پڑی۔ بیغشی دیو کی کے گناہ کا اقبال تھا

(۱۲)

لے بھائی! جب دیو کی کو ہوش آیا۔ تو روپ چند وہاں نہ تھے وہ میز کی طرف دوڑی۔ وہاں یہ رقعہ پڑا تھا:-  
دیو کی! تو نے میرا دل توڑ دیا ہے۔ مجھے ہندوستانی عورت پر اعتقاد تھا۔ میں اُس کی پوجا کرتا تھا تو نے میرا یہ خیال چھیل دیا ہے۔ مجھے تجھ سے یہ اُمید نہ تھی۔ تو تین دن غیر حاضر رہی۔ اور تو نے مجھے کہا کہ میں کیتھرائٹن نانسی کے ہاں تھی۔ مگر تیری ہونے تیرا راز آشکار کر دیا۔ مجھے شبہ ہونے لگا۔ مگر میں نے اُسے ظاہر نہیں کیا۔ مجھ میں یہ جرات، یہ دلیری نہ تھی۔ میں سمجھتا تھا یہ تجھ پر، تیرے چالچلن پر ظلم کرنا ہے۔ مگر جب کیتھرائٹن نانسی نے کہا۔ کہ اُسے تجھ سے ملے مہینوں گزر گئے ہیں۔ تو میرا شبہ

یقین کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ جی چاہتا ہے۔ سمندر میں کود کر  
جان دیدوں۔ زندگی میں کوئی دلکشی، کوئی رنگین نہیں رہی۔  
اب زندہ رہنے سے کیا ہو گا؟.....

روپ چند کے  
دیوکی نے ایک آہ ماری اور کوچ پر لیٹ گئی۔ اس وقت آدھے  
دن میں پہلووں خیال آرہے تھے۔ جس طرح برسات میں شام  
کو ننھے ننھے کیڑے اڑنے لگتے ہیں۔ یہ کیڑے کتنے تکلیف دہ  
ہوتے ہیں۔ کیسے پریشان کن۔ انہیں دیکھ کر طبیعت بیزار ہو جاتی  
ہے۔ وہ آدمی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ مگر اُس کا اٹھنا بیٹھنا  
مشکل کر دیتے ہیں۔ یہی حالت دیوکی کی تھی۔ وہ اُن خیالات سے  
گھبرا رہی تھی مگر میں کچھ ایسا مایوس نہ تھا۔ اخبارات میں اُشہتا  
وئے۔ اجاب کو تار بھیجے۔ دیوکی سارے سارے دن انتظار  
کرتی رہتی تھی۔ سوچتی۔ آج ضرور کچھ خبر آئیگی۔ دن نکلتا اور  
غروب ہو جاتا۔ مگر کوئی خبر نہ ملتی۔ دیوکی آہ سرد بھرتی۔ اور جا کر  
زمین پر لیٹ جاتی۔ اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ اُس کا کھانا پینا  
چھوٹ گیا۔ پننے کی سدھ نہ رہی۔ اُسے دیکھ کر میرے جگر پر  
چھڑیاں چل جاتی تھیں خیال آتا تھا۔ یہ سب میری ہی کثوت  
ہے۔ اُس کا جسم مرجھا گیا تھا۔ صرف ہڈیوں کا ہنجر باقی تھا۔  
نہ چہرے پر رونق تھی۔ نہ آنکھوں میں دلکشی۔ مگر اُس کا جلال

بدستور قائم تھا۔ مجھے اُس کی طرف دیکھنے کی مجرت نہ ہوتی تھی۔  
سُنا تھا۔ سستی کی نگاہ میں آگ ہوتی ہے جو جس پر پڑتی ہے اُسے ہی  
جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے۔ میں اُس آگ سے اس طرح ڈرتا تھا  
جس طرح ہرن کا بچہ بیکان تیر سے ڈرتا ہے۔ میں دیو کی خبر لینے  
ہر روز جاتا تھا۔ مگر سہما سہما رہتا تھا۔ ڈرتا تھا۔ کہ کہیں اُس  
کی آنکھیں میری آنکھوں سے دوچار نہ ہو جائیں۔ اُس کی نفس  
کشियों نے میرے دل میں احترام کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ پہلے  
اُسے دیو ہی سمجھتا تھا۔ اب مہادیوی سمجھنے لگا۔ میں نے یورپ کی  
ہزار ہا مہجور عورتوں کو دیکھا ہے۔ خاوند کی جدائی میں اُن کے  
معمول میں کبھی فرق نہیں آتا۔ وہ اُسی طرح ہنستی ہیں۔ اُسی طرح  
کھیلتی ہیں۔ اُن کے کھانے پینے میں۔ رہنے سہنے میں۔ بننے سننے  
میں کوئی کمی نہیں واقع ہوتی۔ مگر دیو کی کاخاوند کیا گیا۔ اُس کی  
دُنیا ہی تبدیل ہو گئی۔ اُس کے بعد کسی نے اُس کے لبوں پر  
مُسکراہٹ نہیں دیکھی۔ کمرے میں پیش قیمت سامان تھا۔ اُسے  
اُٹھوا دیا اور انتہا درجہ کے غریبوں کی طرح رہنے لگی۔ رام کی  
جدائی میں جو حالت سیتا کی ہو گئی تھی۔ وہی حالت اب دیو کی کی  
تھی۔ وہ کتنا مجھے خود دیو کی نے سُنائی تھی مگر اُسے یہ علم نہ تھا کہ  
اس واقعہ کو عملی شکل میں بھی میرے سامنے اُسے ہی رکھنا ہو گا۔  
اب میرے دل کی ایک ہی آرزو تھی۔ اور وہ یہ کہ جیسے بھی ہو

اپنی غلطی کی تلافی کروں۔ اور روپ چند کو ڈھونڈ کر دیو کی کے  
 آغوش و فایں سونپ دوں۔ سوچتا تھا۔ اُس دن خوشی سے  
 دیوانہ ہو جاؤنگا۔ دنیا میں لاکھوں خوشیاں ہیں۔ مگر وہ کچھ طے  
 ہوئے پاک دلوں کو ملا دینا سب سے بڑی خوشی ہے۔ یہ پاکیزہ  
 منظر، یہ روحانی وصال دیکھ کر دل کو کون سنبھال سکتا ہے؟  
 جوں جوں دن گورتے گئے۔ یہ آرزو بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ  
 راتوں کی نیند بھی حرام ہو گئی۔ تو اپنے فرض سے کوتاہی کر رہا  
 ہے۔ یہ الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔ یہ آواز کوئی وہی آواز  
 نہیں تھی یہ پر ماتا کی آواز تھی۔ اس نے مجھے میرا رستہ دکھا دیا۔  
 میں چند دن سوچتا رہا۔ آخر ارادہ عزم مصمم بن گیا۔ اور میں چند  
 کی تلاش میں روانہ ہوا۔ مغرب کی مادہ پرست طبیعتیں مجھ پر  
 آوازے کسیں گی۔ مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ یہ تحریک  
 خدائی تحریک تھی +

پس فرانس، جرمنی، سوئڈن لینڈ گیا۔ وہاں کے تھیبیٹروں،  
 لیکچر گھروں اور پہاڑوں میں تلاش کیا۔ مگر روپ چند کا سراغ  
 نہ ملا۔ مؤخر الذکر مقام پر اُن کے بل جانے کی مجھے بہت امید تھی  
 مگر وہاں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ میرا دل مایوس ہو گیا۔ جس طرح  
 طالب علم بار بار فیصل ہو کر مایوس ہو جاتا ہے۔ میں نے دیو کی کو  
 خطوط لکھے۔ اور اُن میں اپنی ناکامی کی ساری داستان بیان

کر دی دیوکی نے اُن خطوط کا کوئی جواب نہ دیا۔ مگر بہت سا  
 روپیہ بھیج دیا۔ تاکہ میں اپنی تلاش جاری رکھوں۔  
 میں امریکہ پہنچا۔ یہاں رام کرشن مشن کی طرف سے کئی  
 مندر کھڑے ہیں۔ وہاں ویدانت کا چرچا ہوتا ہے، گیان دھیان  
 کے رموز بیان کئے جاتے ہیں۔ دن رات بھگتی کی لگا لگا بہتی ہے  
 میرا دل خوشی سے اُچھلنے لگا۔ اُمید ہوئی۔ اب کامیابی دُور  
 نہیں۔ روپ چند انہی مندروں میں سے کسی ایک میں ہونگے۔  
 انسان دُنیا لٹا بیٹھتا ہے۔ تو اُسے دھرم کا خیال آتا ہے۔ میں  
 جگہ بجگہ گھومنے لگا۔ جہاں جہاں ویدانت مندر تھے۔ سب جگہ  
 پہنچا اور اُن کی تلاش کی۔ آخر معلوم ہوا۔ کہ وہ کیلیفو رنیا  
 میں ہیں۔ وہاں اُن کی پوجا ہوتی ہے۔ میں اُڑتا ہوا وہاں  
 پہنچا۔ ویدانت مندر دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ مگر وہ وہاں  
 بھی نہ تھے۔ جو کیدار سے پوچھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ انہوں نے  
 بستی سے باہر ایک جھونپڑا بنا رکھا ہے۔ اس جھونپڑے کا نام  
 ”کنج عافیت“ ہے۔ اکثر اُسی میں رہتے ہیں۔ اور گیان دھیان  
 میں محو رہتے ہیں۔ رات ہو گئی تھی۔ جب میں ”کنج عافیت“ میں  
 پہنچا۔ اندر داخل ہوتے ہی اُن کا پاکیزہ چہرہ نظر آیا۔ اس وقت  
 وہ سنیا سی کے لباس میں تھے۔ میں نے انہیں قیمتی سے قیمتی  
 لباس میں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ با رعب راجکرا معلوم ہوتے

تھے مگر ان بھگوے کپڑوں میں وہ ایسے بارعب، ایسے خوبصورت ایسے پاکیزہ دکھائی دینگے۔ یہ خیال نہ تھا۔ وہ اک چوکی پر بیٹھے تھے اور ویدانت کے متعلق بات چیت کر رہے تھے۔ اُن کے سامنے کیلیفورنیا کے بہترین اہل دماغ زانوئے ادب تہ کئے بیٹھے تھے۔ اور اُن کی واقفیت پر دم بخود تھے۔ مغرب۔ مشرق کے قدموں میں لوٹ رہا تھا۔

یہ ایک اُن کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ تو چہرے کا رنگ زیادہ پچکنے لگا۔ جیسے بعض وقت بجلی کے لمپ میں روشنی زیادہ آجاتی ہے۔ میں آگے بڑھ کر اُن کے پاؤں میں گر پڑا۔ اس وقت میرے دل میں دریا ئے عقیدت لہریں مار رہا تھا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ اور میں دوسری شام کو طے کا وعدہ کر کے اپنے ہوٹل کو واپس ہوا۔ مگر رات کو نیند نہ آئی۔ اُس کی جگہ خوشی نے لیلی تھی۔ صبح کو اٹھتے ہی میں نے دیوکی کو بحری تار ویدیا۔ اور اُسے روپ چند کے بل جانے کی اطلاع دی۔ اس کے بعد شہر کی سیر کی۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور ذرا آرام کیا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ اور میں روپ چند کے ”سُنج عافیت“ کی طرف روانہ ہوا۔ اس وقت میرے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ اشتیاق نے اُنہیں لگا دئے تھے۔ اُنگوں کے آسمان پر اُڑا چلا جاتا تھا۔ مگر

منزل مقصود پر پہنچ کر دل بیٹھ گیا۔ وہاں پولیس کے آدمی جمع تھے۔ کنج عافیت میں ہچل کا طوفان مچا ہوا تھا۔ آگے بڑھ کر پوچھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ رات کو ایک عورت کا خون ہو گیا ہے۔ پولیس کو شبہ ہے۔ کہ قاتل روپ چند ہے +

(۱۳)

اے بھائی! یہ سن کر میرا خون منجمد ہو گیا۔ شادی والے مکان میں دو لہا کی اچانک موت سے جو حال ہو سکتا ہے۔ وہی حالت میرے دل کی تھی۔ مجھے اس پر یقین نہیں ہوتا تھا۔ لوگ انوں کی نسبت آنکھوں پر زیادہ اعتبار کرتے ہیں۔ میں اگر یہ رات اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا۔ تب بھی یہی سمجھتا۔ کہ میری آنکھوں میں نقص ہے۔ میں سب کچھ مان سکتا تھا۔ مگر قتل کا فعل روپ چند کی ذات سے منسوب نہیں کر سکتا تھا۔ میرے لئے یہ ناممکن تھا۔ پر اس سے کیا ہوتا تھا۔ مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ امریکہ بھر میں شور مچ گیا۔ روپ چند کو کیلیفورنیا گئے ابھی تھوڑی ہی عرصہ ہوا تھا۔ مگر اُس نے اپنی جاؤ بیانیوں سے سارے شہر کو تسخیر کر لیا تھا۔ اخبارات میں اُسے پر ہیر، گار ہندوستانی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مشہور اخبار نیویارک ٹریبون میں اُسکی تقریریں شائع ہوئی تھیں۔ اور تعریفیہ کلمات کے ساتھ۔ لوگ اُسے روحانی پیشوا سمجھنے لگے تھے۔ یہ خبر جنگل کی آگ کے

مانند آفا نا نزدیک و دُور پھیل گئی۔ میں نے اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ عدالت کی کارروائی دیکھ کر دل دھل جاتا تھا۔ اُمید کی کوئی گہر نہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ حالات بالکل صاف تھے۔ اُن میں کوئی بیج نہ تھا۔ مقتول عورت کی بیوی نیا کے ایک مشہور تاجر کی بیٹی تھی۔ اُسے روپ چند سے عقیدت تھی اس عقیدت نے اُسے اُن کا بندہ بے دام بنا دیا تھا۔ وہ اکثر اُن کے کچھ عافیت میں جاتی رہتی تھی۔ اُس دن بھی حسب معمول گئی۔ مگر اُداس تھی۔ اُسی شام کو یہ قتل کا واقعہ ظہور میں آیا۔ وہ چند کا بیان تھا۔ کہ میں جھونپڑے سے باہر تھا۔ یکایک میں نے جج کی آواز سنی۔ دوڑ کر اندر گیا۔ تو لوسی تڑپ رہی تھی۔ اور اُس کے سینہ میں چھری آدھی سے زیادہ اتر گئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر وہ چھری اُس کے سینہ سے نکال لی۔ میرے کپڑے خون سے تر ہو گئے۔ اتنے میں پولیس آگئی۔ اور مجھے زیر حراست لے لیا گیا اس کے سوائے مجھے اور کچھ بھی علم نہیں ۛ

لے بھائی! مجھے روپ چند کے بیان پر پورا پورا اعتبار تھا میرے پاس اُن پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ مگر عدالت کو قرآن سے معلوم ہوا۔ اس بیان پر یقین نہ آیا۔ مہینوں بحث ہوتی رہی۔ آخر فیصلہ کا دن آگیا۔ اُس دن عدالت میں تاشیو نیکا ہجوم تھا لوگ ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ امریکہ کی

بہترین ایکٹرسوں کو دیکھنے کے لئے بھی کبھی استفد رپیتابی کا اظہار نہ کیا گیا تھا۔ اخبارات کے رپورٹر کیمرے لے کر آئے تھے تاکہ فیصلہ کے عین بعد ملزم کا فوٹو لے سکیں۔ مگر روپ چند کے چہرے پر کوئی فکر، کوئی ملال نہ تھا۔ وہ اس طرح اطمینان سے کھڑے تھے۔ جیسے اُن کا مقدمہ سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ میں نے اُن کی طرف دیکھا۔ مگر نگاہیں نہ مل سکیں۔ یہ سب میری کرتوت تھی۔

یکایک چیوری نے فیصلہ منایا۔ لوگوں کے سانس رُک گئے۔ جیسے دم ہونٹوں تک آگیا ہو۔ چاروں طرف عالمگیر خاموشی چھا گئی۔

”جرم ثابت ہے۔ اس لئے ملزم کو سزا دی جاتی ہے۔  
کہ اُسے گردن سے رسا ہا ندھ کر لٹکایا جائے۔ جب تک  
کہ اُس کا دم نہ نکل جائے“

میرے کلیجے پر گویا کسی نے گرم سلخ رکھ دی۔ زمین پیروں تلے سے کھسکنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے در دیوار اُلٹ جانے کو ہیں۔ یکایک کوئی شخص بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اور عدالت کے قریب پہنچ گیا۔ جس طرح نائک میں انتہا درجہ کے پُراسرار واقعہ کے بعد اُس سے بھی پُراسرار واقعہ دیکھ کر آدمی سٹالٹے میں آجاتا ہے۔ اُسی طرح میں اس آدمی کو دیکھ کر سٹالٹے

میں آ گیا ————— یہ دیو کی تھی ۔  
وہ حج کے پاس پہنچ گئی۔ اور آہستہ سے، مگر مستقل مزاجی کے  
لہجہ میں بولی ”یہ بے گناہ ہے۔ قاتل میں ہوں“  
عدالت میں شور مچ گیا۔ لوگوں کی آنکھوں میں آنسو بھی  
ہوئے تھے۔ سونا جب گرم ہوتا ہے تو پانی بن کر بہ جاتا ہے۔  
یہ پانی سونے اور چاندی کا نہیں تھا۔ یہ پانی ان دھاتوں سے  
زیادہ قیمتی، زیادہ پاکیزہ تھا۔ یہ جذبات کا پانی تھا۔ جیوری کے  
ممبر چونک کر کھڑے ہو گئے۔ سرکاری وکیل حیرت سے ہاتھ سر پہ  
پھیرنے لگا روپ چند سوائے موت کا حکم سن کر نہ گھبرائے تھے  
مگر دیو کی کے ایک فقرے نے اُن کے ہونٹ خشک کر دیئے۔  
وہ اُس کی طرف اس طرح دیکھنے لگے۔ گویا پاگل ہو گئے ہوں +  
عدالت نے سوال کیا ”تو کون ہے؟“  
”ملزم کی بیوی“

عدالت نے چند لمحہ سکوت کیا اور تب :-  
کورٹ انسپکٹر سے کہا ”گرفتار کر لو۔ مقدمہ نیا رنگ  
اختیار کرنے کو ہے“

یہ گرفتاری دیو کی کی موت کا پیش خیمہ تھی۔ مگر دیو کی کو اسکی  
پرزوانہ بھتی۔ بلکہ وہ اسوقت ایسی خوش تھی۔ جیسے کسی افلاس زدہ  
کو معاد فیئہ مل گیا ہو یہ خوشی اُس کے چہرے سے، آنکھوں سے،

اور حرکات سے ظاہر تھی +

(۱۴۷)

اے بھائی! دیو کی نے اپنے آپ کو موت کے مُنہ میں دے کر اپنے خاوند کو چھڑا لیا۔ مگر اس سے روپ چند خوش نہیں ہوئے۔ وہ اب ہر وقت مغموم رہتے تھے۔ وکیل وعدہ معشوق کے مانند پیشیاں بھگتتے لگے۔ عدالتی کارروائی پھر سے شروع ہوئی۔ وہ چند چاہتے تھے۔ جس طرح بھی ہو سکے۔ دیو کی کو چھڑا لیں مگر یہ آسان نہ تھا۔ دیو کی نے خود اقبال جرم کر لیا تھا۔ اُس نے جو بیان دیا۔ اُس میں صاف صاف کہہ دیا۔ کہ یہ قتل میں نے کیا ہے۔ میرا خاوند مجھ سے روٹھ کر یہاں چلا آیا تھا۔ میں اُس کی جُدائی برداشت نہ کر سکی۔ یہاں جلی آئی۔ مگر خاوند کے سامنے آنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ دلوں میں فرق آ گیا تھا۔ یہاں آ کر مجھے شبہ ہوا۔ کہ لوسی کو میرے شوہر سے محبت ہے۔ میں یہ برداشت نہ کر سکتی تھی۔ میں اپنی زندگی دے سکتی تھی۔ مگر شوہر اور شوہر کی محبت نہ دے سکتی تھی۔ مجھے زہر چڑھ گیا۔ دل و دماغ دونوں کھولنے لگے میں نے اُسے ایک دو دفعہ سمجھایا۔ مگر اُس نے میری بات پر دھیان نہ دیا۔ بولی۔ میں اس محبت سے دست بردار نہیں ہو سکتی مجھ پر دیوانگی کا عالم طاری ہو گیا۔ میں اپنے شوہر کے جھوٹے میں گئی کہ اُنہیں اُس عورت اور اُس کے چلن سے

آگاہ کر دوں۔ مگر وہاں پہنچ کر کیا دیکھتی ہوں۔ کہ وہاں ٹوسی  
 بیٹھی ہے۔ میری دیوانگی میں اور اضافہ ہوا۔ میں نے اک جوش  
 کی حالت میں میز سے چھری اٹھالی۔ اور اُس پر حملہ کیا۔ چھری  
 سینے میں اتر گئی۔ اب میری آنکھیں کھلیں۔ خیال آیا۔ میں نے  
 کیا کر دیا۔ مگر سوچنے کا وقت نہ تھا۔ میں جلدی سے باہر آ گئی۔  
 دیوکی کے اس بیان سے عدالت میں سنسنی پھیل گئی۔ لوگوں میں  
 کاناپھسکیاں ہونے لگیں۔ بعض لوگ کہتے تھے۔ یہ بیان حرف  
 بہ حرف سچ ہے۔ اس عورت نے اپنی لاج رکھ لی ہے۔ بعض کہتے  
 تھے۔ ہندوستانی عورت نے اپنی جان بے کر شوہر کو چھڑا لیا ہے۔  
 ورنہ قتل کا الزام اس سے کوسوں دُور ہے۔ روپ چند کھڑے  
 دیکھتے تھے اور خاموش تھے۔ واقعات نے اُن کی قوت گویائی  
 سلب کر لی تھی۔ جس طرح سُورج کی گرمی سے تالاب کا پانی خشک  
 ہو جاتا ہے۔ اور اُس کی تہ دکھائی دینے لگتی ہے۔ اُسی طرح  
 ہجومِ یاس نے روپ چند کے دل کا اطمینان اُڑا دیا تھا۔ اُنکا  
 وہ غصہ قائم نہ رہا تھا۔ دیوکی کے لئے ہر دم روتے رہتے تھے۔  
 دل کی تہ دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اپنی طرف اتہائی کوششیں  
 صرف کر رہے تھے مگر اُن کے کئے کچھ بنتا نظر نہ آتا تھا۔ کیا حسرت  
 آفرین واقعہ تھا۔ کہ پیوی موت کے کھلے مُنہ میں جا رہی تھی  
 اور خاوند سامنے کھڑا مُنہ نکلتا تھا۔ مگر کچھ کرنے سکتا تھا۔

ایک دن میں بہت رات گئے ہٹل گیا۔ قریباً سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو چکے تھے۔ میں نے کپڑے اتارے۔ اور لیٹ گیا۔ مگر آنکھوں میں بند نہ تھی۔ رہ رہ کر سوچتا تھا۔ کیا سچ وچ دیوگی کو پھانسی پر چڑھنا ہوگا۔ اس خیال سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ آنکھوں میں پانی آجاتا تھا۔ معاً ساتھ کے کمرے سے کچھ بات چیت کی آواز آئی۔ میں نے دیوار کے ساتھ کان لگاؤںے معلوم ہوا۔ ایک مرد اور عورت باتیں کر رہے ہیں۔ مرد نے پوچھا۔ تو اب تمہارا ارادہ ہے کہ نہیں۔ جو کچھ کہنا چاہو صاف کہو۔ مجھے زیادہ وعدوں پہ نہ رکھو۔ میں جا ہتا ہوں۔ جتنی جلد ہو سکے۔ شادی ہو جائے +

عورت۔ تم ذرا صبر کیوں نہیں کرتے۔ میری بہن کو قرعے ایسی تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں۔ شادی ہونے دیکھ کر لوگ کیا کہیں گے۔ آوازے کئے لگیں گے۔ شہر میں بٹ مشکل ہو جائیگا +

مرد۔ لوگوں کی یہ دانہ کرو +

عورت۔ پر وا کیسے نہ کروں۔ آخر اسی شہر میں رہنا ہوگا +

مرد۔ ہر کی موت کو بڑا اطلال ہے کیا؟

عورت۔ تم مرد ہو۔ مردوں کے دل سخت ہوتے ہیں۔ مگر میں تو

مرد ہوں۔ اتنی سنگدل کیسے ہو جاؤں؟

عورت۔ جس طرح قتل کیا تھا +

عورت - چُپ - کوئی سن لیگا +

مرد - ہندوستانی عورت قربان ہو رہی ہے۔ بعض وقت میرا دل  
کانپ جاتا ہے +

اندھیرے میں شعلے اُمید چمک گئی۔ میں کمرے سے باہر  
نکل آیا۔ اس وقت میں ایسا خوش تھا۔ کہ زمین آسمان کی سدھ  
تھی۔ بھاگا بھاگا پولیس کے دفتر میں جا پہنچا۔ دوسرے دن  
اصلی قاتل عدالت میں پیش ہوئی۔ مقدمہ کارنگ بدل گیا۔ یہ  
عورت مقنول لڑکی کی بہن تھی۔ اول اول اُس نے اپنے بچاؤ  
کی بہت کوشش کی۔ مگر آخر پولیس اور عدالت کے ہتھکنڈوں  
میں آگئی۔ قانون کے آہنی قبضے نے اُسے بھاگنے کی مہلت نہ  
دی۔ اُس نے اپنے بیان میں اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔ کہا کہ وہ  
دونو بہنیں سو پچند کو چاہتی تھیں۔ اول اول ملزمہ کو یہ  
معلوم نہ تھا کہ اُس کی بہن کو بھی اُس سے عشق ہے۔ کچھ دیر  
بعد جب یہ راز اُس پر ظاہر ہوا تو وہ پھری ہوئی شیرنی کی  
طرح غصہ میں بھر گئی۔ اور چھوٹی بہن سے بولی۔ تو اُس ہندوستانی  
پادری کا خیال چھوڑے۔ ورنہ میں تیری بوٹیاں نوح لوں گی۔  
مگر لوسی پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ جس طرح تپے ہوئے  
توے پر پانی کی بوند کا اثر نہیں ہوتا۔ تیجہ یہ ہوا۔ کہ ایک دن  
موقعہ پا کر اُس نے اُسے اُس ہندوستانی کے جھونپڑے میں قتل

کر دیا؟

دیوکی رہا ہوگئی۔ اب اُس عورت پر مقدمہ چلنے لگا۔  
میں نے ایک دن اُس سے ملاقات کی اجازت لے کر  
پوچھا تو کیا اجازت ہے مجھے ایک سوال پوچھنا ہے؟  
”کیا مقدمہ کے متعلق؟“

”نہیں اُس کا مقدمہ سے کچھ ایسا تعلق نہیں؟“  
”پوچھیے؟“

”میں دو نو بہنوں کو اُس ہندوستانی سنیا سی کا خیال تھا۔  
کیا وہ سنیا سی بھی تم میں سے کسی ایک پر فریفتہ تھا؟“  
معلوم ہوتا ہے۔ اس سوال سے اُس کے زخم دل ہرے  
ہو گئے۔ سر جھکا کر بولی: بالکل نہیں۔ وہ ہم دونوں سے کسی  
کی بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی بہن کو  
اُس کے جھونپڑے میں جا کر اُس کی چھری سے قتل کیا۔ تاکہ  
ایک ہی وار سے دونوں دشمنوں کا خاتمہ ہو جائے۔ مگر قسمت میں  
یہ بدراہے یہ علم نہ تھا؟“

لے بھائی! میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ جیسے کسی کا بخار اتر  
جائے۔ میں روپ چند کے جھونپڑے میں پہنچا۔ وہاں روپ چند  
میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے اپنے بازو  
پھیلا دئے۔ یہ بازو میرے لئے بہشت کے دروازوں سے کم نہ

تھے۔ مجھ پر کیف کا عالم طاری ہو گیا۔ میں سمجھتا تھا۔ انسانی جنم لینا آج مبارک ہوا۔ چاروں طرف اُچھلتا پھرتا تھا۔ مجھے یہ خیال نہ تھا۔ کہ کوئی دیکھے گا۔ تو کیا کہیگا۔ میں اپنی دیوانگی کا خود اظہار کرنا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد آرام سے بیٹھے۔ تو میں نے کہا: آپ نے ہم لوگوں کا تو خیال ہی چھوڑ دیا۔ صورت دیکھنے کو جی ترس جاتا ہے ۞

روپ چند نے آسمان کی طرف دیکھ کر آہ سرد بھری اور جواب دیا  
”بھگوان کی یہی مرضی تھی۔ کیا ہو سکتا ہے۔ اتنی یہ جھوٹے ٹراول  
میں بس گیا ۞

”تو کیا آپ واپس نہ چلیں گے؟“

”ارادہ تو ایسا ہی ہے ۞“

”اور غریب دیو کی کا کیا بنے گا؟“

”اُس کا میرے روبرو نام نہ لو ۞“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”اُس کا نام سن کر میرا دل جلنے لگتا ہے۔ اُس نے اپنی مرجاوا

پر پانی پھیر دیا ۞“

میں نے جوش سے کہا: آپ کو بچانے کے لئے اُس نے

آپ کو موت کے منہ میں ڈال دیا تھا ۞“

”یہ سب سچ ہے۔ پر گناہ کا داغ خون سے بھی نہیں مٹتا ۞“

”تو آپ کے دل میں گرہ بندھ گئی؟“  
 ”اور ایسی جو کبھی نہ کھلے گی۔ تم اب اس مضمون پر زیادہ گفتگو نہ  
 کرو۔ مجھے اس سے روحانی صدمہ ہونا ہے؟“  
 ”مگر دیو کی بیگناہ ہے؟“

روپ چند نے جواب نہ دیا۔ بظاہر اس بات سے اُن کے دل پر  
 چنداں اثر نہ ہوا۔ مگر میں نے سارا واقعہ اُن کے سامنے رکھ دیا  
 اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ تب اُن کے چہرے کا رنگ تھیل  
 ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو لہرانے لگے۔ جس کے بعد بارش  
 ہوئی۔ روتے روتے بولے: ”ہری سین! میں نے اُس پر  
 ظلم کیا ہے۔ وہ دو تین دفعہ یہاں آئی تھی۔ مگر میں نے جھڑک  
 دیا۔ پتہ نہیں۔ اُس وقت کیا کہنی ہوگی۔ اب میرے دل میں  
 اُس کی طرف سے کوئی عُبار نہیں۔ میں اُسے مجرم سمجھتا تھا۔  
 مگر یہ خیال نہ تھا۔ کہ قصور میرا ہی ہے۔ چلو! میں اُس سے  
 معافی مانگوں گا“

ہم دونو چلنے کو تیار ہوئے۔ اتنے میں دیو کی سامنے سے آتی  
 دکھائی دی۔ اُسے دیکھ کر مجھے بے اختیار رونا آ گیا۔ وہ ایسی  
 نحیف و زار ہو گئی تھی۔ جیسے موسم خزاں میں پتوں کی ٹہنی مرجھا  
 جاتی ہے۔ روپ چند نے اُسے دیکھتے ہی باہیں پھیلا دیں دیو کی  
 جوش مسرت سے آگے بڑھی۔ مگر قدموں میں گر کر بیہوش ہو گئی۔

پنڈت جی نے اُسے اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ اور رونے لگے۔ یہ  
آنسو خوشی کے آنسو تھے +

اُس رات روپ چند کے جھونپڑے ”کنج عافیت“ کا اور ہی عالم  
تھا۔ چاروں طرف مسرت کھیلتی پھرتی تھی۔ ہم سب کو گیا ہوا قرا  
مل گیا تھا۔ بیس وہاں کچھ دن ٹھہرا۔ اُن دنوں کی یاد اب بھی  
سینہ میں پھل چھاوتی ہے۔ اے بھائی! میں نے کئی شہر دیکھے  
ہیں۔ اور کئی شہر دیکھو نہ گا۔ مگر جو لطف، جو رنگینیاں جو رعایا  
مناظر اُس جھونپڑے ”کنج عافیت“ میں تھے۔ وہ نہ کہیں اور ملے  
ہیں نہ ملیں گے۔ وہاں پریم کی ہوا بہتی تھی۔ عشق کے پھول کھلنے  
تھے۔ دیو کی اور روپ چند کے پاکیزہ خیالات نے میرے مغربی  
دل کو تبدیل کر دیا۔ اب وہ وہاں نہیں۔ ہندوستان چلے گئے  
ہیں۔ اور کشمیر میں چشمہ ویرسی ناگ کے کنارے رہتے ہیں۔ وہاں  
بھی اُنہوں نے ایک جھونپڑا بنا لیا ہے۔ اور اُس کا نام بھی  
”کنج عافیت“ ہی رکھا ہے۔ میرے ہندوستان جلنے کا باعث  
وہی جھونپڑا ہے۔ میں اُس کے مناظر دیکھنے کے لئے اس طرح  
تڑپ رہا ہوں۔ جس طرح مچھلی پانی کے لئے تڑپتی ہے۔ میں نے  
اپنا جنم بھوم آج تک نہیں دیکھا۔ میں سمجھتا ہوں۔ وہ سرزمین بڑی  
دل فریب، بڑی پاکیزہ بڑی خوبصورت، سرسبز و نشاداب ہوگی۔  
مگر جب میں ان تمام صفات کو یکجا جمع کرنا ہوں۔ تو میرے سامنے

تسخ عافیت کا نقشہ آجاتا ہے میرا تخیل اس سے پرے نہیں  
جاسکتا ۛ

(۱۵)

یہ کہتے کہتے ہری سین نے سر جھکا لیا۔ ایک اجنبی کے دل  
میں حُب وطن کا جذبہ کس طرح بیدار ہوتا ہے۔ یہ مجھے پہلی دفعہ  
علم ہوا۔ باہر نیگلوں کھلا سمندر گرج رہا تھا۔ اندر میرے  
دل میں ہزاروں خیالات لہریں مار رہے تھے۔ ان خیالات  
نے میری زبان بند کر دی۔ میں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ اسکے  
بعد سر اٹھا کر ہری سین کی طرف دیکھا۔ اسوقت وہ مجھ سے  
کتنا نزدیک، کتنا اپنے قریب دکھائی دیتا تھا۔ میں نے محنت بھری  
اجہ میں کہا "ہری سین!"

ہری سین نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں۔ اُن میں تینوں  
بجائے دل رکھا تھا۔ اُس نے مجھے ہموطن بھائی کہا۔ اور اس  
سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا ۛ

جہاز رات کی تاریکی میں تیزی سے چل رہا تھا۔ اور ہم  
لمحہ بہ لمحہ ساحل ہندوستان کے قریب پہنچ رہے تھے ۛ











